بار اول | اپریل ۱۹۴۶ء | قیمت ؏

ناشر
محمد طفیل مالک ادارۂ فروغ اُردو
لاہور

مطبوعہ
تعلیمی پریس بیرون اکبری دروازہ
لاہور

ترتیب

حکیم محمد امین کے نام

جو ڈاکٹر بھی ہیں اور

مَیں اُن کا دوست بھی ہوں اور مریض بھی

عرضِ ناشر

یہ کام تو نقادوں کا ہے کہ وہ کسی مصنف کی فنی خوبیاں اور نقائص قارئین کے سامنے پیش کریں۔ میں تو صرف اتنا مجرم ہوں کہ شوکت صاحب کی اس کتاب کا ناشر ہوں۔ اور ہمیشہ سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے بلند پایہ مصنفین کی اچھی کتابیں ادب نواز حلقے کے سامنے پیش کرنے کی سعی کروں۔ چنانچہ آج میں اپنے نزدیک اس کتاب کو بھی اپنی ہی خواہش کی تکمیل کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ شوکت صاحب کی تمام تصنیفات میں جو اہمیت اس کتاب کو حاصل ہے وہ ان کی کسی اور کتاب کو میسر نہیں۔

اس مجموعہ میں شوکت صاحب نے اپنے اُن تمام مضامین کو یکجا پیش کیا ہے جو نقادانِ فن کے نزدیک فنی اعتبار سے شوکت صاحب کے چوٹی کے مضامین میں شمار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ نئے مضامین بھی شامل کر لئے گئے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ سارے نئے مضامین اس معیار کے مطابق نہیں ہو سکتے اسی لئے تو شوکت صاحب کو "وجہ تسمیہ" میں لکھنا پڑا کہ اس انتخاب میں میرا بھی حصّہ ہے۔ پھر بھی مَیں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ نئے مضامین شوکت صاحب کی نظر میں لاکھ بُرے سہی۔ لیکن ادبی حیثیت میں ان مضامین کو بھی اُردو ادب میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔ انشاء اللہ۔

مَیں آخر میں شوکت صاحب کے علاوہ خود بھی محترم مولانا محمد صدیق صاحب مالک صدیق بک ڈپو لکھنؤ اور برادرم ظہیر صاحب کا خاص طور پر ممنونِ کرم ہوں کیونکہ ان ادب نواز دوستوں کا اس مجموعہ کی ترتیب و تکمیل میں بہت بڑا حصّہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان حضرات کی کرمفرمائی شاملِ حال نہ ہوتی تو شوکت اس مجموعہ کو مرتب کر سکتے اور نہ ہی میں شائع کر سکتا۔

محمد طفیل

۲۶ راپریل ۱۹۴۶ء

وجہ تسمیہ

آجکل کتابوں کے نام رکھنے کا طریقہ یا تو سائن بورڈوں سے اخذ کیا گیا ہے یا مشہور اشتہاری کارخانوں سے، سنگ و خشت، شعلہ و شبنم، عرش و فرش، آیات و نغمات وغیرہ کا تخیل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصغر علی محمد علی، مینوڈ لنشا بلیبی، مادھو شمبھو ناتھ، لارنس میو سے متاثر ہے۔ اب سے کچھ پہلے کبھی ناولوں اور ڈراموں کے نام اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ لیلےٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گلرو زرینہ، منصور موہنا وغیرہ۔ یا کتابوں کے نام رکھنے کا یہ طریقہ نیا بھی ہے اور پرانا بھی۔ اس میں صنعتِ تضاد بھی ہے تداخلِ فصلین بھی۔ مگر زیرِ نظر کتاب کا نام "بُرے بھلے" ایک دوسری خاص رعایت سے رکھا گیا ہے۔ دراصل ادارۂ فروغِ اردو کے مالک عزیزی محمد طفیل صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ وہ میرے تمام مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کا ایک عطر مجموعہ شائع کریں اور اپنے مضامین میں سے انتخاب میں خود کروں۔ مگر میں نے اُن کی اس رائے سے کچھ اختلاف کیا اور انہوں نے میری رائے سے کچھ اتفاق، ارادہ ہوا کہ کتاب کا نام رکھ دیا جائے

"اختلاف و اتفاق" میرا مشورہ یہ تھا کہ نئے مضامین کا مجموعہ شائع ہو اور انتخاب کو مصنف کی موت کے بعد کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ آخر سمجھوتہ یہ ہوا کہ کچھ انتخاب اور کچھ نئے مضامین کچھ میرا انتخاب کچھ پبلشر صاحب کا انتخاب۔ اس لئے کہ وہ میرے انتخاب سے مطمئن نہ تھے اور میں ان کے انتخاب پر ایمان لانے کو تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تھا چڑا اور ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا دال کا دانا اور چڑیا لائی چاول کا دانا، دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ اب ڈر یہ ہے کہ اس کھچڑی انتخاب کے سلسلہ میں پڑھنے والے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ "دور ہوتے میری آنکھیں دکھتی ہیں۔"

مشہور مثل ہے کہ دہی والا اپنے دہی کو کبھی کھٹا نہیں کہتا۔ لیکن جب وہ خود تو اسی دن کھاتا ہے جب واقعی دہی میٹھا ہو۔ اولاد والدین کے لئے ایک عجیب معمہ ہوتی ہے۔ والدین اپنی بڑی چھوٹی منجھلی اور سنجھلی اولاد سے یکساں محبت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں لیکن ان میں سے جس کسی کو کاٹا جائے درد یکساں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود ہر ماں باپ کا ایک لاڈلا بچہ بھی ہوا کرتا ہے۔ محبت سب کی برابر ہی مگر اس بچے کا خیال غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی رکھا جاتا ہے اور واقعی والدین کا یہ کہنا کہ اولاد اولاد سب برابر

ہے دیانت داری کے بھی خلاف ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک حسین بچہ ایک بدصورت بچے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اولاد ہونے کی وجہ سے بدصورت بچے سے تنفر پیدا نہ دوسری بات ہے۔ لیکن حسین بچے پر پیار آنا بھی ایک قدرتی چیز ہے۔ ایک بچہ ذہین ہے اور دوسرا گاؤدی دونوں کو ایک لاٹھی کیسے ہانکا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح مصنف کی اولاد اس کے مضامین ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہر مضمون کے لئے اپنے دل میں ایک شفقت پاتا ہے مگر خود اس کی نظر سے اپنے مضامین کی اصل حقیقت پوشیدہ نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا کونسا مضمون ہونہار نکلا اور کونسا نالائق نکل گیا۔ کس نے نام روشن کیا اور کس نے لٹیا ڈبو دی۔ کونسا باعثِ فخر ہے اور کونسا باعثِ ننگ۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک اہلِ قلم کا ہر نتیجۂ فکر یکساں حالات اور یکساں ماحول کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آتا۔ ایک مضمون کے لئے تو [illegible] مصنف کا دل خود چاہتا ہے۔ مضمون دماغ میں خود بخود پیدا ہوتا ہے بجائے اس کے کہ دماغ سے کہا جائے کہ تیرا دل چاہے یا نہ چاہے مگر ایک مضمون پیدا کر۔ شعر زادن اور شعر گفتن میں جو فرق ہے وہ مصنف خوب سمجھتا ہے مگر حالات خود اس کو بھی مجبور کر دیا کرتے ہیں کہ وہ شعر گفتن کے ساتھ ساتھ شعر زادن سے بھی کام لے۔ ایک مشاق شاعر طرحی مشاعروں میں اپنی کاریگری کے ماتحت ایک کامیاب

غزل سامعین کو یقیناً سنا سکتا ہے مگر وُہ بات اس غزل میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی جو اس کی طبعزاد غزل میں پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مضمون نگار سے طرحی مضامین لکھوانا اور اُن سے توقع یہ رکھنا کہ وہ اس کے طبعزاد مضامین کی ٹکر کے ہونگے یقیناً زیادتی ہے۔ مَیں دوسرے مضمون نگاروں کے متعلق تو نہیں جانتا البتہ مجھ پر یہ سخت وقت اکثر گذرے ہیں۔ کہ میں ایک طبعزاد مضمون لکھ کر دس طرحی مضامین لکھنے پر مجبور کیا گیا۔ مثلاً سودیشی ریل ایک طبعزاد مضمون تھا۔ مگر اس مضمون کی کامیابی نے ہر طرف سے فرمائشوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور باوجود انکار کے دو تین سودیشی مضامین لکھنے ہی پڑے۔ مثلاً سودیشی ڈاکخانہ، سودیشی کونسل اور سودیشی سے بدیشی، وغیرہ اسی طرح تعزیت نامی ایک مضمون کو لوگوں نے پسند کیا اور تعزیت کے بعد چالیسواں مجھ سے زبردستی لکھوایا گیا۔ ریڈیو کی تقریروں کے متعلق میں ہمیشہ سے بددل ہوں۔ یہ تمام مضامین طرحی ہوتے ہیں اور ان مضامین کے سلسلہ میں مضمون نگار کو ردیف و قافیہ کی پوری پوری پابندی کرنی پڑتی ہے مضمون کا عنوان ریڈیو کی طرف سے آتا ہے۔ مضمون کا دائرہ تحریر ریڈیو کی طرف سے مقرر اور معیّن ہوتا ہے۔ مضمون کی زبان تک کیلئے ریڈیو کی طرف سے خاص ہدایتیں ہوتی ہیں اور مضمون کے لئے وقت بھی ریڈیو کی طرف سے مقرر ہوتا ہے

کہ پندرہ منٹ کی حدوں سے نہ آگے بڑھو اور نہ پیچھے ہٹو۔ ان پابندیوں کے ساتھ جو مضامین لکھے جائیں گے وہ کیونکر معیاری ہو سکتے ہیں۔ معیار سے میرا مقصد عام ادبی معیار نہیں ہے بلکہ ہر مصنّف کا ایک ذاتی معیار بھی ہوتا ہے اور مصنّف خود اپنے ہر مضمون کو اُس معیار پر جانچ کر بلند یا پست ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں مَیں نے اپنے اُن مضامین کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو مجھے خود پسند ہیں اور طفیل صاحب وہ مضمون شامل کر رہے ہیں جو ان کو پسند ہیں اس دو عملی کے باوجود یہ حق مجھ کو دیا گیا ہے کہ کتاب کا نام میں رکھوں لہٰذا میں ایک ایسا نام رکھ رہا ہوں جو بظاہر شاعرانہ کسرِ نفسی معلوم ہو گی مگر دراصل چل رہا ہوں بڑی سیاسی چال اگر پڑھنے والوں نے اس انتخاب کو پسند کیا تو مضامین میرے ہیں مجھ کو فخر کا حق حاصل ہی ہے اگر ناپسند کئے گئے یہ مضامین تو طفیل صاحب کے انتخاب کا قصور ہے اور میں نے تو کتاب کا نام ہی "بُرے بھلے" رکھ دیا ہے گویا پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس میں دونوں قسم کے مضامین ہیں۔ بہر حال جہاں تک میرے انتخاب کا تعلق ہے۔ مَیں نے نئے اور پرانے تمام مضامین کے سلسلہ میں صرف اُن ہی مضامین کو شامل کیا ہے، جن کے لکھنے میں بیرونی اشارے کے علاوہ اندرونی تحریک کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری اور طفیل صاحب کی پسند کو دوسرے بھی پسند کرینگے یا نہیں۔ بہر صورت ہم

دونوں اپنے نزدیک اس مجموعے کو ایک بہترین تحفہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ تحفے کے سلسلہ میں تحفے کی قسم اور قیمت سے زیادہ پیش کرنے والے کے خلوص کو دیکھا جاتا ہے۔ میں اور تو کچھ نہیں جانتا اپنے خلوص پر اعتماد ضرور کرتا ہوں۔ رہ گئے طفیل صاحب۔ وہ اس مجموعے کی زیب و زینت کے سلسلہ میں بھی اپنی طرف سے خلوص کا پورا ثبوت دینگے۔ اس مجموعے کے کچھ مضامین میرے لاڈلے بچّے ہیں اور کچھ طفیل صاحب کے پسندیدہ بچّے۔ بہرصورت ان دونوں قسم کے بچّوں کو اچھے لباس میں دیکھ کر جو مسرّت مجھے ہو سکتی ہے وہ شاید کسی اور طرح حاصل نہ ہو۔ دراصل طفیل صاحب کے ذوقِ سلیم پر مجھے ایسا ہی اعتماد ہے کہ میں اس مجموعے کے دلآویز تخیّل میں ابھی سے کھویا ہوا ہوں۔ میں نے اپنے پسندیدہ مضامین پیش کئے ہیں اور وہ یقیناً طابع اور ناشر کی حیثیت سے اپنے پسند کا ایک معیاری نمونہ اس کتاب کی صورت میں پیش کرینگے۔ انشاء اللہ

ممتاز منزل۔ لکھنؤ
۱۰ر اگست ۱۹۴۵ء

شوکت تھانوی

میری پہلی کتاب

میری پہلی کتاب ایک تو وہ تھی جو مجھے پڑھنے کے لئے دی گئی تھی۔ کیا کیا احتیاطیں تھیں اس کتاب کے سلسلے میں۔ کہیں میلی نہ ہو جائے کہیں اس کا سر ورق نہ پھٹ جائے۔ کہیں کوئی اسے چرا نہ لے جائے۔ سر ورق پر ایک اور کاغذ چڑھا کر گندگی کا تحفظ ہو گیا۔ پھر اس گرد پوش پر کچھ ایسے پھول بنا دیئے جو نہ بہاریں کھلتے ہوں نہ خزاں ہیں نہ گلشن میں ملتے ہوں نہ صحرا میں، صرف ہمارا قلم ہی ان پھولوں کو کھلا سکتا تھا۔ ان کے بیچوں بیچ اظہارِ ملکیت کے لئے لکھ دیا کہ "مالک ایں کتاب شیخ محمد عمر عرف ممن میاں" صرف

یہی نہیں بلکہ ایک شعر بھی ؎

جب تک کہ باغ سُرخ ہے سبز گلاب ہے
جب تک کہ زندہ میں ہوں یہ میری کتاب ہے

اب گویا یہ کتاب ہماری تھی اور ہم اس کو ماسٹر صاحب سے پڑھتے بھی تھے اور اُس کے دُلار بھی اس طرح کرتے تھے۔ جیسے کسی ارمان بھری ماں کی گود میں بچّہ ہو اور وہ کبھی بال سنوارے کبھی سُرمہ لگائے اور کبھی نظر بد سے بچانے کیلئے کاجل کا ٹیکہ بھی لگا دے۔ چنانچہ ہماری اس کتاب پر نظر بد سے بچانے کیلئے ٹیکے بھی جابجا لگے ہوئے تھے اور ہمارا نام تو اب تقریباً کتاب کے ہر صفحہ پر موجود تھا۔

خیر یہ تو بچپن تھا مگر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب خدا نے وُہ دن دکھانے کا ارادہ کیا کہ ہماری پہلی کتاب یعنی ہماری پہلی تصنیف شائع ہو کر ہم کو بھی مصنّف بنا دے۔ مضامین تو خیر لکھا کرتے تھے۔ ادیب ہوئے اتنے دن گذر چکے تھے کہ اب اس میں کوئی ندرت باقی نہ رہی تھی مگر جب ہمارے ایک دوست نے یہ طے کیا کہ ہمارے مضامین کا مجموعہ کتابی شکل میں آنا چاہئے تو ایک دم ہم ایک ایسی دُنیا میں پہنچ گئے جہاں اب تک ہمارا گذر نہ ہوا تھا ہماری کتاب۔ ہم مصنّف۔ کتاب کے سرورق پر ہمارا نام۔ کتاب کا ایک

خوبصورت نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ پھر اُسی قسم کی کتابوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ موٹی موٹی کتابیں۔ مجلّد۔ سنہری نام۔ کتابیں ہمارے گرد ناچنے لگیں اور ہم کو ایسا محسوس ہوا گویا ہزاروں کتابوں کی یہ فوج ہم کو سلامی دے رہی ہے۔ پہلے اس خیال پر خواب کا دھوکہ ہُوا۔ پھر شُبہ ہُوا کہ شاید ہمارے یہ دوست ہم سے کچھ قرض مانگنے والے ہیں لہذا ہم کو خوش کر دیا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ یقین ہو گیا کہ دوست کا یہ ارادہ سنجیدہ بھی ہے اور بے غرض بھی ہے تو جی چاہا کہ ایسے سچّے، ایسے مخلص اور ایسے جاں نثار دوست پر سے صدقے ہو جائیں۔ ان کو عُذر صرف یہ تھا کہ وُہ کچھ حقِ تصنیف نہ دے سکیں گے اور ہم خوش تھے کہ وُہ بھی حقِ دوستی ادا کر رہے ہیں کہ ہم کو ایکدم آدمی سے مصنّف بنائے دیتے ہیں۔ یہ اعزاز تو اگر خدا توفیق دیتا تو ہم خود کچھ صرف کر کے حاصل کرتے نہ کہ ہم خود کوئی مطالبہ کرتے جس کو خدا عزّت دے، وُہ روپیہ کے پیچھے دوڑے۔ توبہ توبہ یہ زر پرستی اور یہ کفرانِ نعمت ہم سے کیونکر ممکن تھی۔ ہم نے اپنے دوست سے کہہ دیا کہ دوست حساب دوستاں در دل، جہاں حقِ دوستی ادا ہو رہا ہو وہاں حقِ تصنیف کا کیا سوال ہے تمہارا یہی احسان کیا کم ہے کہ تم میری کتاب چھاپ رہے ہو مجھ کو مصنّف بنا رہے ہو اور مجھ کو زندگی دے رہے

ہو جیسے موت بھی مجھ سے نہ چھین سکے۔ البتہ یہ ضرور کرنا کہ کتاب ذرا خوبصورت چھپے۔ خوبصورت بھی ہو اور تندرست بھی، یعنی ذرا موٹا کاغذ لگے تاکہ موٹی رہے جلد وغیرہ ضرور ہو اور جلد پر کتاب کے نام کے علاوہ میرا نام بھی سنہری حروف میں ہو اور ذرا نمایاں۔

مختصر یہ کہ رسالوں کے صفحات پھاڑے گئے۔ مضامین کی نقلیں فراہم کی گئیں اور جلد سے جلد کتابت شروع کر دی گئی اب دن رات یہی ایک فکر کہ کسی طرح کاتب شارٹ ہینڈ بن کر خوشنویسی کر دے کسی طرح وہ یہ مژدہ جانفزا سنا دے کہ کتابت ختم ہو گئی۔ ادھر شوق کی رفتار اب اور ابھی کی متقاضی اور کاتب صاحب کی صبر آزما ادائیں کہ بیٹھے افیون گھول رہے ہیں۔ نوک پلک درست ہو رہی ہے۔ پھر قیامت یہ کہ ماشاء اللہ بھرا پُرا گھرانہ ان کا اور صحتیں سب کی خراب۔ آج اس لئے کتابت ملتوی کہ بڑی لڑکی کی آنکھیں آ گئی ہیں۔ کتابت میں بینائی کی خاص ضرورت رہتی ہے اور جب نورِ چشم ہی آشوبِ چشم میں مبتلا ہو تو کاتب بیچارہ کیا کرے۔ پہلے ان کے گھر جاتے رہے خیریت دریافت کرنے۔ پھر اپنے گھر پر دعا کرنے لگے کہ خدا جلد تر کاتب صاحب کی دخترِ نیک اختر کو شفائے کامل عطا فرمائے اور آخر کار یہاں تک کیا کہ کاتب

بابوجی نے ذرا ترش رو ہوکر جواب دیا :-

جناب والا! میں بہو نہیں ہوں۔ سُن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے کوڑی کم نہ لونگا۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔"

مَیں "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایا تھا آج کیا ہوگیا کہ ایکدم بڑھ گیا۔"

بابو۔ "کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے"

مَیں۔ "یہ کہیئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائیگی۔"

بابو۔ "لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے۔"

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آرہی تھی اور کچھ غصہ آرہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئیگی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائیگا۔ آخر کار مَیں نے طے کرلیا کہ مَیں بغیر ٹکٹ کے سفر کرونگا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے

چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ بابو صاحب نے پھر آواز دی:۔

"سنیئے تو جناب، ٹھہریئے تو جناب، دیکھئے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیئے، آیئے دہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجئے ـــــــ اب وُہ بھی نہ دیجیئے گا، اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لایئے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔ "ایک روپیہ دینگے۔ ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہونگے۔ مگر واللہ کمال کیا اُنہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے:۔

"لایئے صاحب لایئے۔ بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا۔ لیکن وُہ ٹکٹ ریل کا ٹکٹ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اُس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اُس پر کچھ چھپا ہُوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر درجہ دوئم کانپور لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی

تھی جو غالباً اُن کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو اِدھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا مُنہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وُہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسّم ہو کر کہنے لگے :-

"جناب والا رات کو سورا جیہ ملا ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وُہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب۔ آپ تو سفر کیجئے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پُوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھئے"

بابو صاحب نے تسلّی تو دے دی۔ مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے، نہ کرایہ، نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے اُنہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہ حال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے۔ ہم اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سامان کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اُلٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال۔ مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا

اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دُکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اُٹھانے کو کہا اُس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔

"اندھے ہو گئے ہو، دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر" ہم "مُعاف کیجئے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پُورے پُورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے پہلے تو اس صُورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صُورت کا ہو گا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اُٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیئے کہ یہی گاڑی کانپور جائیگی یا کوئی اور، سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا۔ جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا "کا جانی بھیا ہمکا ناہیں مالوم" یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ

کلاس کے معزز پسینجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ "اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائیگی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائیگی۔ اسی لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف" ہم نے گھبرا کر پوچھا:-

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائیگی اسوقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟

اب ہم بالکل راضی برضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو بُرا اس لئے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی اچھا اس لئے نہیں کہتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی اُمید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر کبھی لوٹے میں پانی لا کر کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر کبھی انجن

کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی۔ صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بآواز بلند چیخنا شروع کیا۔

"بیٹھنے والے مسافرو بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے"۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف، مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لئے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے ان سے ہم نے لاکھ کہا۔ ارے سیکنڈ کلاس ہے اماں سیکنڈ کلاس ہے۔ بھائی سیکنڈ کلاس ہے۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے۔ "ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے۔ ہم ہو ٹکس لیا ہے" خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہدیں مگر

گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انہیں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے عرض کر دیا جس کا جواب اُنہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا۔ "بیٹھیے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں۔ سب بھائی ہیں۔ سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے سب کو برابر کا سمجھئے، جائیے، تشریف رکھئے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔ ہم یہ کھرا جواب سُن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ مگر گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے۔ اُنہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے۔ لیکن ابھی

تک نہیں آئے۔ آدمی بلانے کے لئے گیا ہُوا ہے"۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا۔ اس لئے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوٹنی نہ تھی۔ اس لئے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسا وقت تھا جب ہمارے مُنہ سے بد دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا۔ اس لئے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے اُچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے ہیں۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا۔ اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض اُن کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سَن سَن کرنے لگا ایک کھدر پوش چپڑ زبر یا بزرگوار لال اور سبز گارڈ کی جھنڈیاں لئے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب

نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں۔ مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی اُن کے بیجا غصہ کا جواب کڑک کر دیا۔ "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں میرا کیا قصور ہے۔ دو گھنٹہ سے للّو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ نیز بھی بتا دیا تھا کہ رکابگنج کے چوراہے سے یا علیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا جس طرح گھوڑے کے لئے دانہ گھاس ضروری ہے۔ بالکل

اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتلایئے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد للو فائرمین کوئلہ کی گٹھری لئے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:۔

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ تو آنہ میں ملا ہے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔ "روکو۔ روکو۔ گارڈ صاحب رہ گئے" گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا۔ "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا ——— لائن کلیر" ڈرائیو

نے بھی چلّا کر جواب دیا۔ "لے لیا تھا ----- لے لیا تھا ----- گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کرلیا تو پھر فرمایا۔ "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لئے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے۔ اور اگر ابھی شرط بدکر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریکِ سفر سے پوچھا۔ "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہونگے۔ غصہ ہم پر اتارا، اور جھڑک کر فرمانے لگے۔ "میاں خدا کا شکر بھیجو کہ یہ گاڑی ہی ہے، تم میل ایکسپریس لئے پھر رہے ہو" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی جھک جھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:-

جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کونسا تھا؟"

ڈرائیور۔ "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟"

اسٹیشن ماسٹر۔ "ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا۔ دوسرا ڈرائیور رکھ لونگا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی۔"

ڈرائیور۔ "دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجیے نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے۔ خوب کیا گاڑی لائے اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے۔ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے"۔

اسٹیشن ماسٹر۔ "دیکھئے گارڈ صاحب منع کر لیجئے اس کو کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں، میں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں"۔

گارڈ۔ جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو، ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ۔ بھائی تم ہی ہٹ جاؤ یارے۔ ارے چھوڑو بھی ہٹو بھی

سنو تو سہی، ارے یار سُنو تو۔

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیئے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بیچارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آکر نہایت گھبراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"گارڈ صاحب اے گارڈ صاحب، ابھی وُہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پر آ رہی ہے غضب ہو گیا"۔

گارڈ بھی یہ سُنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا:۔

"مُسافرو جلدی اُترو جلدی اُترو، گاڑی لڑتی ہے گاڑی لڑتی ہے جلدی اُترو"

سب مسافر گڑبڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بُری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے مُنہ پر آ پڑا۔ مَیں ایک دم سے چونک پڑا۔ حُقّہ کی نے میرے مُنہ پر آ کر گری تھی۔ حُقّہ جل چکا تھا۔ آرام کُرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے

بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اُٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس لئے کہ
اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ سوائے
آرام سے سونے کے۔

جس کیلئے کیا سفر

خدا نہ کرے کہ کبھی کسی شریف مرد آدمی کو ریل میں یا اسٹیشن پر یا مسافر خانہ میں یا ٹکٹ گھر کے قریب کسی سے عشق پیدا ہو جائے۔ اس قسم کا عشق جس کا تعلق ریلوے سے ہو۔ بیچارے عاشق کو بجائے "صحرا الصحرا" پھرانے کے "اسٹیشن بہ اسٹیشن" پھراتا ہے اور وہ فرسٹ کلاس کے زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے جھانک کر دل لے جانے والا جلوہ پھر مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ریل ہوتی ہے جس کا کام ہے چلنا، کوئی جلوہ گہ ناز تو ہے نہیں کہ ایک ہی جگہ پر قائم رہے اور عشاق اس دیوار بیٹھے سر پھوڑا

کریں۔ اس ریل کے عشق کا تو بس یہی علاج ہے کہ یا تو اُس رہزن تمکین و ہوش کا ٹکٹ دیکھ کر اُسی جگہ کا ٹکٹ خرید لیا جائے اور "جو نیّت امام کی وہی ہماری" کہہ کر ساتھ ہو لے، یا پھر اُسی ٹرین کے نیچے لیٹ کر جان آفریں کو جان سپُرد کر دی جائے۔ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عشق کا حملہ ہوتے ہی بیچارے عاشق کے ہوش و حواس ہی کب قائم رہتے ہیں کہ اس پروگرام کو پیشِ نظر رکھ کر اس پر عمل کرے۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حُسن تو بجلی گرا کر ریل کے ساتھ چھک چھک کرتا ہوا چل دیتا ہے اور بیچارہ عاشق پلیٹ فارم پر اس طرح تڑپتا ہے گویا ریل سے کچل کر جان دے رہا ہو۔ اگر عشق نے زیادہ ستایا تو اُسی سمت کو جانے والی کسی گاڑی پر خواہ وُہ مال گاڑی کیوں نہ ہو بیٹھ کر عاشق اپنی خانماں بربادی بلکہ آوارہ گردی کی بسم اللہ کرتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی "جی، آئی، پی۔ این، ڈبلیو، آر اور اسی طرح کی نہیں معلوم کتنی ریلوں میں سفر کرتے گزر جاتی ہے۔ لیکن پھر دیکھ لوں اِک بار میں جلوہ ترا" کی تمنّا کبھی پُوری نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ جانتے ہُوئے بھی اختر نے جھانسی کے اسٹیشن پر دہلی سے بمبئی جانے والی ایکسپریس کی ایک "پسنجرہ" کو دل دے ہی دیا۔ اختر

تھے تو ہمیشہ کے "ہولو" مگر ہم کو یہ اُمید نہ تھی کہ ان میں بھی عشق و محبت کی صلاحیت موجود ہے۔ جب وہ حضرت ایکسپریس کے آنے کے بعد زنانہ درجہ کے سامنے بڑی دیر تک مُنہ اُٹھائے کھڑے رہے تو ہم اُن کی اس حرکت کو بھی "ہولوپن" سمجھتے رہے۔ لیکن جب ایکسپریس کے جانے کے بعد بھی وہ مجسّم بنے کھڑے رہے تو ہم کو ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں ان پر فالج تو نہیں گرا ہے، کہیں ان کے قلب کی حرکت تو نہیں بند ہو گئی ہے، کہیں ان پر جادو کر کے کسی نے پتھر کا تو نہیں بنا دیا، کہیں یہ سردی کی شدّت سے اکڑ تو نہیں گئے۔ یہاں تک کہ شبہات رفتہ رفتہ بڑھنے لگے اور ہم پر ایک خوف کی سی کیفیّت طاری ہو گئی کہ ان کو چھونے کی بھی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ دُور ہی سے کھڑے ہوئے آوازیں دے رہے تھے، اگر اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دیتے تو اندیشہ تھا کہ کہیں لاوارث مال سمجھ کر ان کو مال گودام میں نہ ڈال دیا جائے، اور خود اس لئے نہیں چھوتے تھے کہ کہیں ہم بھی ایسے ہی نہ ہو جائیں، لیکن آخر یہ کب تک ہوتا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ اس بیچارے کو چھوڑ کر چلے جاتے، حالانکہ نئی روشنی کے دوستوں کا یہی فیشن ہے۔ کہ وقت پڑنے پر بیگانہ بن جاتے ہیں، لیکن ہم اس کو ذرا شرافت سے بعید

سمجھتے ہیں۔ لہٰذا دل مضبوط کر کے اُن کی طرف بڑھے اور درود شریف وغیرہ پڑھ کر اُن کے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وُہ چونک پڑے اور اُن کے چونکنے سے ہم اُچھل پڑے۔ اُنھوں نے ایک "ٹھنڈی سانس" کھینچکر کہا "کیا ایکسپریس چھوٹ گئی"؟ ان کے اس سوال سے ہم کو اندیشہ ہُوا کہ بیچارے کا دماغ خراب ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہ کہیں حملہ نہ کر بیٹھیں کہا:۔ "کیا تم سو رہے تھے"؟

اختر۔ "کیا تم سو رہے تھے"؟

مَیں۔ "یہی تو پُوچھ رہا ہُوں کہ کیا تم سو رہے تھے، جو ایکسپریس کے چھوٹنے کی خبر بھی نہ ہوئی"۔

اختر۔ "واقعی میں سو رہا تھا۔ مَیں نے خواب دیکھا ہے وُہ خواب میں بھی وُہ خواب تھی"۔

میں۔ "عجیب چیز ہیں آپ بھی یعنی گھنٹہ بھر سے منہ اُٹھائے کھڑے ہیں گویا بنا کر کھڑے کر دیئے گئے ہیں"۔

اختر۔ "ہاں بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہوں دیوانہ بنا کر، سودائی بنا کر، وحشی بنا کر، مجنوں بنا کر"

میں۔ "پاگل تو ہو ہی اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے، آخر تم ہی بتاؤ یہ کونسی ادا تھی؟"

اختر "ادا، ہاں ادا تھی جو میری قضا بنے گی اور جس کو میں بقا سمجھونگا"

اب تک تو ہم مرد بنے اُن کی اوٹ پٹانگ باتیں سُنا کیے لیکن اب ایسی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ اگر وُہ ہماری طرف بڑھتے تو ہم چیخ مار کر یا تو بھاگ جاتے یا بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے۔ لیکن ہم نے اپنے کو اور بھی مضبوط کیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر ذرا تھرّائی ہوئی آواز سے دریافت کیا:۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو"۔

اختر۔ "اچھّا وُہ کون تھی"؟

میں۔ "کون"؟

اختر "اچھّا وُہ کون تھی"؟

میں "کون"؟

اختر "وُہ جو گئی ہے"۔

میں "بمبئی دہلی ایکسپریس تھی"۔

اختر۔"نہیں وُہ غارتِ گرِ ایمان جو اس میں بیٹھی تھی جو مجھ کو اپنا بنا کر یہیں چھوڑ گئی جو چلتے وقت مجھ سے مِل بھی نہیں جس نے ادھر رُخ بھی نہ کیا جو مجھ کو اپنا بنا کر جانتی بھی نہیں۔ ۶۔

"ہائے جسے خبر نہیں کچھ میرے حالِ زار کی"

مَیں۔"کیا ہوا کیا ہ کس کو تم کہہ رہے ہو میں ابھی نہیں سمجھا"

اختر۔"وہی میرے دل کی مالکہ"

مَیں۔"کیا کوئی عورت تھی"

اختر۔"ہاں ایک کافرہ تھی، ایک حُور تھی، ایک مست شباب تھی۔ جس کی ایک بہکی ہوئی نظر میرا دل چھین لے گئی، اور جس نے مجھ کو تڑپا کر ایک نظر بھی نہ ڈالی"

مَیں۔"استغفراللہ اتنی دیر کے بعد اب ہم سمجھے کہ آپ پر عشق کا بھُوت سوار ہے اور اس خطرناک عشق کا جس کو ہم مہلک ترین عشق یعنی "ریلوے عشق" سمجھتے ہیں"۔

خیر ہمارا خوف تو دُور ہوا مگر بیچارے اختر کی حالت پر ہم نے افسوس ہی نہیں کیا بلکہ انا للہ وانا الیہ راجعون بھی پڑھ دیا۔ اس لیے کہ اب ہماری

نظروں کے سامنے ان کا مستقبل موجود تھا، اور ہم جانتے تھے کہ اگر واقعی ان حضرت نے دل دے دیا ہے تو اب ان کا علاج پاگل خانہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم اُن کے قریب آئے اُن کے سر سے ٹوپی اُتار کر ہوا دی لیکن جب وُہ ہوا لگنے سے سردی کی شکایت کرنے لگے تو ہم نے ان کو تسلّی دی۔ کامیابی کے سبز باغ دکھائے اور دل بہلانے کی ترکیبیں کرتے رہے لیکن وُہ یہی پوچھا کئے کہ "آخر وُہ تھی کون؟"

(۲)

عشق کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں کہ دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور وُہ چلا گیا جو بیچارے ان عاشقوں کو زندگی بھر سمجھاتے ہیں۔ انہیں کا دل خوب جانتا ہو گا کہ ان لوگوں سے کتنا سر کھپانا پڑتا ہے اور یہ لوگ سمجھانے سے کتنا سمجھتے ہیں۔ واللہ عجیب بات ہے کہ یہ عاشق لوگ جو بات کہی جائے، اُس کا اُلٹا ہی مطلب ہمیشہ سمجھا کرتے ہیں اور سمجھانے والے سے بڑھ کر دُنیا میں ان لوگوں کا دشمن اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو "ناصح ناداں" کہتے ہیں۔ اس کو اپنی زبان میں طرح طرح کی مہذّب گالیاں دیا کرتے ہیں اور اس سے ایسا جلتے ہیں گویا یہ بھی رقیب ہے۔ تقریباً یہی حال ہمارا تھا کہ ہم

اپنے تو گرفتارِ عشق اختر کو سمجھانا چاہتے تھے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہمارا دوست ہے اور مجمع احباب میں اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو تاش کی گڈی میں جوکر کو، یا تھیٹر میں کومک کو یا اخبار وں میں پنچ اخبارات کو حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں وہ عشق کا دیوانہ بن کر جان پر کھیل گیا تو ہمارا لطف زندگی بھی باقی نہ رہے گا لیکن وہ حضرت ہمارے اس جذبہ کی قدر یہ فرما رہے تھے کہ ہم کو خود غرض، ابن الوقت، احمق، طوطا چشم، غیر ہمدرد، نامعقول، بیوقوف، اور اس قسم کی جتنی معزز گالیاں ہو سکتی ہیں، سب دے رہے تھے۔ وہ تو کہئے کہ ہم ان کو مرفوع القلم سمجھ چکے تھے، ورنہ یہ عشق وشق تو سب دھرا رہ جاتا، پلیٹ فارم پر اچھی خاصی فوجداری ہو جاتی۔ اور انصاف سے دیکھئے تو فوجداری کی بات بھی تھی کہ آپ کسی شریف آدمی کو برا بھلا کہیں اور وہ خاموش رہے یہ کیسے ممکن ہے، ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے تو اُن سے کہا کہ بھائی جو کچھ ہونا تھا ہوا، اگر وہ موجود ہوتی تو پولیس وغیرہ کے سپرد کر دیتے اور اگر اُس کے پاس سے تمہارا دل برآمد کر لیتے تو تم کو دل مل جاتا۔ اور اُس کو سزا ہو جاتی، لیکن اب تو وہ ہے ہی نہیں، لہذا اب جانے دو، چھوڑو اس قصّہ کو اور چلو گھر۔ اب بتایئے کہ ہم نے اُن سے کون سی غیر شریفانہ بات

کہی، لیکن وُہ بگڑ گئے اور کہنے لگے "آپ کی ہمدردی کا شکریہ، آپ تشریف لے جائیے میں آجاؤنگا۔ سچ ہے ؎

جس پہ گزری ہو یہ وہی جانے
جو کہ بید رد ہو وُہ کیا جانے

مَیں "تو بتاؤ کہ آخر مَیں کیا کروں؟ جو کہو وُہ کروں، اب تو جو کچھ گزرنا تھی گزر چکی، اب صبر کرو خداوندکریم نعم البدل دیگا"۔

اختر "نعم البدل، اور اس کا، ناممکن ہے، اور اگر ممکن بھی ہو تو مجھ کو منظور نہیں"۔

مَیں۔ "اچھا تو پھر اب کیا کیا جائے"۔

اختر "کچھ نہیں، بس مجھ کو چھوڑ دو، میں اسی طرف جاؤنگا جدھر میرا دل لے جایا گیا ہے"۔

مَیں "یعنی ریل کی پٹری پٹری چلے جاؤ گے اچھا پھر"۔

اختر۔ "مجھ کو پھر کے بعد کچھ نہیں معلوم، بہرحال مجھ کو چھوڑ دو"۔

مَیں "ذرا صبر سے کام لو دیوانگی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔

اختر۔ "بھائی صاحب تو آپ اپنی صحیح الدماغی کو لئے دولت کدہ تشریف

لے جائیں، مجھ کو میری قسمت پر چھوڑ دیں"۔

مَیں۔ "اچھّا مَیں نے چھوڑا تم کو، اب بتاؤ تم کیا کرو گے"؟

اختر۔ "مَیں اسی طرف کو جاتا ہوں جدھر ایکسپریس گئی ہے اور اُس کے لئے جاتا ہوں جس کا پتہ و نشان بھی مجھ کو نہیں معلوم"۔

مَیں۔ "اچھّا تم مجھ کو آدھ گھنٹہ دو کہ مَیں اپنے حواس بجا کرکے شاید کوئی ترکیب نکال سکوں"۔

اختر میری بات پر راضی ہو گئے اور مَیں نے یہ طے کرنے کے بعد کہ اُن کی ضد پُوری کر دی جائے۔ یہ فیصلہ کیا کہ دُوسری ممبئی کی طرف جانے والی گاڑی پر تھوڑی دُور تک اُن کو سیر کرا دی جائے۔ لہٰذا مَیں نے ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھا اور اس سے اور بھی اطمینان ہوا کہ گھنٹہ بھر بعد میل ٹرین چھوٹے گی جو ایکسپریس کو بنیا کے جنکشن پر پکڑ لیتی ہے۔ لہٰذا مَیں نے طے کر لیا کہ بنیا تک جانا چاہئے اور وہاں یہ حضرت اپنی محبوبہ کی زیارت بھی کر لیں گے۔ مَیں نے ان کو واپس آ کر یہ مژدہ سُنایا، مگر وُہ تو مجھ کو ہمیشہ کا جھوٹا نہ سہی تو کم از کم اس عشق کے آغاز سے تو جھوٹا ہی سمجھنے لگے تھے۔ لہٰذا وُہ اس خوشخبری کو ایک غلط تسلّی سمجھے لیکن جب مَیں نے اُن کے علاوہ اپنی بھی قسم کھائی، تو

تو اُن کو ذرا اطمینان ہوا اور اب اُنہوں نے اپنا رُخ بجائے جانیوالی گاڑی کے آنے والی گاڑی کی طرف پھیر دیا۔ یہ پہلی حرکت تھی جو صبح سے اب تک اُنہوں نے کی، اس کے علاوہ باقی تمام حالات بدستور تھے کبھی آہ سرد بھرتے تھے کبھی ع۔

ترے تیر نیمکش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

گنگناتے تھے اور کبھی ایک چشم غضب اس ناکردہ گناہ پر بھی ڈال دیتے تھے، ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر ہم نے دل لیا ہوتا، یا ہم نے دل لینے والی کو بھڑکا کر اُن کا دل اُڑوا دیا ہوتا یا ہمارا کسی طرح بھی اس معاملہ میں دخل ہوتا تو ایک بات تھی، لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم بے خطا ہیں وہ حضرت ہم کو اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ ہماری ہمدردی ملاحظہ فرمائیے کہ ہم نے چائے پیش کی لیکن اس کا جواب بجائے شکریہ کے ایک حقارت آمیز چین جبیں سے دیا گیا بلکہ جب ہم نے مع ٹوسٹ کے چاء کی پیالی بڑھائی، تو حضرت اس زور سے جھڑک کر بولے کہ چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی، مجبوراً ہم نے خود چائے پی لی اور چپ ہو کر بیٹھ رہے۔ حالانکہ اُن کو ہر طرح کا اطمینان

تھا کہ اب چلیں گے اور وہ نظارہ بھی حاصل ہو جائیگا جس کے لئے وہ پھڑک رہے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُن کا یہ حال ہونا جاتا تھا گویا کسی سخت قسم کا دورہ شروع ہو گیا۔ اُلجھی ہوئی سانسیں لے کر گھبرائی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف اس طرح دیکھتے تھے گویا کسی کو قتل کر کے بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ کم از کم اُن کی وہ خوفناک صورت دیکھ کر میں تو سہم ہی جاتا تھا۔ اب اُن حضرت کو مجھ سے ایک نئی شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ میں ہی گاڑی کی آمد میں تاخیر کا باعث ہوں، کئی مرتبہ ڈانٹ کر مجھ سے پوچھا "گاڑی کب آئیگی" جب میں نے کہا کہ "اپنے وقت پر آئیگی"۔ تو مجھ کو اور بھی کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اب کیا آئے گی۔ وہ کیوں آنے لگی"۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گاڑی نے آکر میری جان بچا لی اور اُن کے ساتھ میں بھی گھبرا کر اپنے سامنے والے ڈبہ میں چڑھ گیا جو اتفاق سے اسباب وغیرہ کا ڈبہ نہ تھا۔ آدمیوں ہی کا ڈبہ تھا ورنہ معلوم نہیں اسباب کے ڈبہ میں گھسنا پڑتا یا گارڈ کے ڈبہ میں اس لئے کہ ان کی وحشت مجھ کو بھی بغیر دل کھوئے ہوئے نیم وحشی بنا چکی تھی۔

(۳)

بمبئی میل کی رفتار سے میرے تخیّلات کی رفتار اور میرے تخیّلات کی رفتار سے تیز اختر کی وحشت کی رفتار تھی۔ ہم دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ ریل کی چھک چھک کے سُروں پر اپنے تخیّلات کے نغمے اُتارتے ہوئے سفر طے کر رہے تھے، کہ یکایک مجھ کو ٹکٹ نہ خریدنے کا خیال پیدا ہوا اور یقین جانیئے کہ تمام بدن کا خون جو اختر صاحب کی وحشت سے بچ رہا تھا اس بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے خشک ہو گیا۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا، اگر اختر سے کہتے تو ڈر تھا کہ ہمارے دوسرے ہم سفر نہ سُن لیں، اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی ریلوے ملازم ہو جو ہم کو اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ کے دام معہ جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ بم سازی کے شبہ میں پولیس کے سپرد کر دے۔ دوسرے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اختر کہیں زنجیر نہ کھینچ لے کہ بیٹھے بٹھائے پچاس روپیہ جرمانہ ادا کرنے کے لئے ہم کو اپنے اور اختر کے کپڑے بیچنا پڑیں۔ لہٰذا ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن صورت تو ایسی ہو گئی گویا اپنے کسی شریک سفر کا لوٹا چرانے کے بعد پکڑے گئے ہوں اور خود اُس بار شرمندگی ہم کو سر نہ اُٹھانے دیتی ہو۔ ہم اسی چکر میں تھے کہ اب کیا ہو گا کہ

اختر نے چونک کر پوچھا "کیا بینا آگیا ؟"

میں "ابھی کہاں سے آیا یہ تو للت پور ہے اب آئیگا بینا۔"

اختر "خدا جانے کب آئیگا ؟ کیا ہمیشہ اتنی ہی دیر میں بینا آتا تھا یا آج گاڑی سست چل رہی ہے ؟"

میں "تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ اب جلدی کیا ہے۔ اس کے بعد بس بینا ہی سمجھو۔"

اختر "آج گاڑی کو یقیناً مجھ سے ضد ہو گئی ہے ورنہ اتنی دیر نہ لگتی میرا دم اُلجھ رہا ہے۔ میں پریشان ہوں مجھ سے وقت نہیں کٹتا ہے۔"

یہ کہہ کر اختر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور میں بھی اس طرح اُن کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا گویا ہم دونوں میں ایک ہی اسپرنگ لگا ہوا تھا۔ میں نے اختر سے بیٹھ جانے کو کہا اور معلوم نہیں کیوں اختر نے میری ہدایت پر عمل کیا، میں بھی بیٹھ گیا اور اختر کے دل کو اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اختر دہی بڑے کھاؤ گے ؟"

اختر "نہیں"

میں "للت پور کے دہی بڑے اور پاپڑ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔

اختر۔ "نہیں"۔
میں۔ "نہیں کیا؟ واقعی مشہور ہیں، تم کھا کر تو دیکھو یاد کرو گے مزا"۔
اختر۔ "نہیں"۔
میں۔ "اچھا پاپڑ کھا لو"۔
اختر۔ "نہیں"۔

اب میں نے گفتگو کا رُخ بدل کر کہا "تمہارے والد للت پور میں رہ چکے ہیں اور تمہارا بچپن یہیں گزرا ہے۔ جب تم چھوٹے سے تھے اور تم کو ضعف معدہ کی شکایت تھی تو یہاں کے ایک بوڑھے سے حکیم جن کا بھلا سا نام تھا یاد نہیں آتا تمہارے معالج تھے اور انہوں نے تم کو فاقہ پر فاقے دلوائے، تم بہت کمزور ہو گئے تھے اور بدنیتی بھی ہر وقت کھانے کے لئے روتے تھے۔ ہم تو اُس وقت بڑے سے تھے اور تم کو بہت چھیڑا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تمہاری ٹانگوں میں گھس کر جو ہم کھڑے ہوتے تو تم بُری زور سے گرے اور تمہاری پیشانی پر زخم بھی آ گیا۔ اُس دن تمہارے والد ہم پر بہت خفا ہوئے تھے اور تم سے کہا تھا کہ اس شریر کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ مگر ہائے بچپن دوسرے ہی دن پھر اس طرح ہم دونوں گلے مل گئے۔ گویا کچھ

ہوا ہی نہ تھا تم کو معلوم ہوتا ہے کچھ یاد نہیں"۔

اختر "نہیں"۔

اب ہم نے دیکھا کہ اس شخص نے "نہیں" کہنے کی قسم کھائی ہے تو اس سے ایسی گفتگو کی جائے کہ یہ "ہاں" بھی کہے تا کہ اس کے بعد کوئی اور امکان پیدا ہو۔ لہٰذا ہم نے ڈھونڈھ کر ایسا جملہ کہا کہ "ہاں کے علاوہ کچھ نہ کہا جاسکے۔

اختر "اونھ"۔

اب تو ہم اور بھی پریشان ہوئے کہ یہ "اونھ" تو "نہیں" سے بھی زیادہ خطرناک جواب ہے۔ اس لئے کہ بعد والا درجہ خاموشی ہے لہٰذا ہم کو ذرا فکر پیدا ہو گئی لیکن فوراً ہی ہم کو خیال آیا کہ اِن سے اُسی کے متعلق سوال کئے جائیں جس میں یہ کھوئے ہوئے ہیں اور واقعی یہ سوالات ضروری بھی تھے لہٰذا ہم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا:۔

"تم بمبئی میں اُس کو پہچان لوگے؟"

اختر۔ "اُس کو میں یہیں سے پہچان رہا ہوں"۔

میں۔ "یہاں سے تو خیر پہچان رہے ہو مگر وہاں کس طرح پہچانو گے۔ تم اس کی پہچان کیا ہے؟"

اختر: "جس کی طرف مجھ کو جھانسی سے کشاں کشاں لایا جا رہا ہے وُہ بنیا
میں بھی مجھ کو اپنے قریب کھینچ لے گا"۔

مَیں: "مگر مجھ کو تو پہچان بتاؤ کہ کیسی صورت تھی، کیا وضع قطع تھی تاکہ میں بھی
پہچان سکوں"۔

اختر: "صورت میں نے دیکھی نہیں بس ایک بجلی سی چمک کر میری آنکھوں
کو جھپکا گئی، اور مَیں تابِ نظّارہ نہ لا سکا"۔

میں: "کچھ لباس وغیرہ کے متعلق بتا سکتے ہو"۔

اختر: "ہاں شاید ریشمی بیازی رنگ کی ساری تھی اور بالوں میں اُسی رنگ
کا ریشمی فیتہ تھا"۔

مَیں: "بظاہر مسلمان معلوم ہوتی تھی یا کوئی اور"۔

اختر: "کافرہ تھی کافرہ"۔

مَیں: "یعنی مسلمان نہیں تھی، اچھّا کچھ اور بتاؤ"۔

اختر: "مَیں کیا بتاؤں ایک برق مجسّم تھی ایک شعلۂ لرزاں تھی، ایک حدتِ
مطلق تھی، ایک کفر سراپا تھی"۔

میں: "ان پہچانوں سے تو میرے فرشتے بھی کسی کی شناخت نہیں کر سکتے

ایسا پتہ —— بینا جنکشن دُور سے نظر آنے لگا اور میرے مُنہ سے نکل گیا کہ بینا آگیا۔

یہ سنتے ہی اختر اس بیتابی سے کھڑکی میں جُھکے کہ مجھ کو اُن کا ہاتھ پکڑ لینا پڑا، کہ کہیں گر نہ پڑیں یا چھلانگ نہ ماریں"۔

(۴)

بینا کے اسٹیشن پر اختر تو بیتابی کے ساتھ اُتر گئے۔ لیکن ہم کو اپنے پاس ٹکٹ نہ ہونا پھر یاد آگیا اور ہم اپنے کو چھپاتے ہوئے اُترے۔ لیکن بیک بینی و دوگوش تھے، لہذا یہ جھوٹ بولا جاسکتا تھا کہ ہم مسافر نہیں ہیں کسی کو سوار کرانا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک ہمارے بچنے کا امکان تھا۔ گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی کی تلاش میں چلے، آگے آگے اختر تھے اور پیچھے پیچھے ہم، اختر تو آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ایک طرف کو چلے جا رہے تھے، اور ہمارا یہ حال تھا کہ جو عورت نظر آتی تھی ہم بڑھ کر اختر سے پوچھ لیتے تھے کہ "دیکھو یہ تو نہیں ہے" لیکن اختر ہمارے اس سوال کا جواب دینا بھی غیر ضروری سمجھتے تھے اور بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اس بے تُکے پن کو نا جائز سمجھ کر ایک قُلی سے پوچھ لیا کہ ایکسپریس کہاں ہے اور صحیح پتہ معلوم

کرنے کے بعد اختر کو لے کر دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچے جہاں ایکسپریس موجود تھی، اختر نے بیتابی کے مارے دو تین سیڑھیاں اُترنا بھی مناسب سمجھا اور مجھ کو پکڑ کر اس طرح پھاندے کہ اگر ذرا میں نہ سنبھلتا تو خود مع اختر صاحب کے ایک پان والے پر اس طرح گرتا کہ مُنہ ٹوٹ جاتا ورنہ پان والا توڑ دیتا۔ چلتے چلتے اختر ٹھہر گیا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر کہنے لگا

وُہ ہے میرا مرکزِ نظر وُہ ہے ـــ

میں نے بھی اُس کی انگلی کی سیدھ میں بندوق کے نشانہ کی طرح شُست باندھ کر دیکھا، تو ایک پیازی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی نازنین کی پشت دکھائی دی، جس پر لمبے لمبے ریشمی بال ایک پیازی رنگ کے فیتے سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے بل کھا رہے تھے اور ساری میں ہوا نے ایک تموّجی کیفیت پیدا کر دی تھی، وُہ نازنین ایک سیکنڈ کلاس میں بیٹھی تھی، اور بظاہر یا تو پارسن تھی یا عیسائن۔ میں دیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔ اختر کا تو وہی حال ہو گیا جو جھانسی کے اسٹیشن پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو نصب کر دیا گیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اُس شخص کی آنکھیں بھی پتھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا مجال جو ایک مرتبہ بھی

جھپکی ہوں۔ جب اسی عالم میں کافی دیر ہوگئی تو میں نے کہا:۔

"اب جاکر قریب سے دیکھ لو، نہیں تو ریل چھوٹ جائیگی"۔

اختر "ہوں"

میں "ہوں کیا، دیکھنا ہے تو دیکھ بھی لو۔ صورت ہی نہ دیکھی تو کیا دیکھا"۔

اختر: "مگر میں دیکھ نہ سکونگا۔ بغیر دیکھے میرا یہ حال ہے۔ شاید دیکھ کر میں زندہ نہ رہ سکونگا"۔

میں "نہیں دیکھ لو۔ چلو میں بھی چلتا ہوں اُدھر سے دیکھیں گے"۔

اختر خود تو نہیں چلے، چلائے گئے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا، اور وہ ڈگمگاتی ہوئی چال سے آگے بڑھے ہم دونوں چکر کاٹ کر اس رخ پر پہنچے جدھر اختر کی مطلوبہ کا رخ روشن تھا، لیکن اُدھر سے جاکر دیکھا تو اُدھر بھی پشت ہی تھی۔ غالباً اس عرصہ میں اُس نے اپنا رخ بدل دیا، یا اس کے دونوں رخ یکساں تھے۔ بہرحال ہم دونوں پھر اپنی پہلی جگہ پر واپس آئے۔ اس مرتبہ اُس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ لیکن میں نے غیر ارادی طور پر گردن جھکالی، غالباً اس لیے کہ پرائی چیز تھی اور اختر نے اس لیے آنکھیں چار نہ کیں کہ کلوروفارم کے اثرات کا اندیشہ

تھا۔لیکن میری گردن ایک دم سے اختر کے "ارے" کہنے سے اُوپر اُٹھی، اب جو دیکھتا ہُوں تو ایک پچپن سالہ بڑی بی چیچک کے نقشیں چہرے کو ہماری طرف اُٹھائے نہایت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور غالباً اختر کی رُوح قفسِ عنصری سے عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی ہو گی۔ دیر تک ہم دونوں مُنہ کھولے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے آپس میں ایک دوسرے کی نقل اُتار رہے ہیں اور جب ہوش بجا ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اس طرح پیٹھ موڑ لی گویا۔ ع۔

تم اپنا مُنہ اِدھر کر لو ہم اپنا مُنہ اُدھر کر لیں

کی مشق کر رہے ہیں۔ مَیں نے احتیاطاً پھر اُن بزرگ کے قریب جا کر اُن کو اس لئے دیکھا کہ کہیں یہ کوئی اور نہ ہوں۔ لیکن دراصل یہ وہی برقِ مجسّم، وہی شعلۂ لرزاں، وہی وحدتِ مطلق اور وہی کفرِ سراپا نفیس، جن کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ اختر کا یہ حال تھا کہ ایک چُپ لگ گئی تھی، میرے سامنے مُنہ بھی نہ کرتا تھا اور مجھ کو اختر کے "ہولو پن" پر البتہ غصّہ آ رہا تھا کہ اگر اپنی اولاد ہوتی تو عاق کئے بغیر نہ چھوڑتا مگر "دیوانہ تو دیوانہ" کرتے تو کیا کرتے۔ آخر مَیں نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ کہا کہ "دل دینے سے

پہلے دیکھ لینا چاہیئے کہ کس کو دیا جا رہا ہے اور عشق کرنے کے لئے تعین عمر لازمی ہے۔"

اختر نے اپنا منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر پیٹھ موڑ لی۔ اور میں واپسی کے لئے ٹرین کا وقت دیکھنے ٹائم ٹیبل کی تلاش میں بک اسٹال کی طرف چل دیا۔ معلوم نہیں کہ ایکسپریس کب چھوٹی۔

گھوڑ دوڑ

گھوڑ دوڑ کی ایجاد کسی نہ کسی ضرورت کی اولاد ضرور ہو گی مگر نہ تو اب وُہ ضرورت ہمارے سامنے ہے اور نہ وُہ مقصد ہمارے پیشِ نظر۔ کہتے ہیں کہ گھوڑوں کی نسل کو ترقی دینا اور خاندانی یعنی نجیب الطرفین گھوڑوں کی اعلیٰ تربیّت گھوڑ دوڑ کا سب سے پہلا مقصد تھا۔ معلوم نہیں کہ اس سلسلہ میں گھوڑوں نے کس قدر معاشرتی یا تمدّنی ترقی کی البتہ انسان اس دوڑ میں گھوڑوں سے کہیں آگے نکل گیا۔ اُس نے گھوڑ دوڑ کو ایک خاص فن کا درجہ دے کر رفتہ رفتہ افیون تک کا درجہ دے دیا اور گھوڑوں

کو ترقی دینے کے لئے ایسی ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ آخر کار خود اپنی تقدیر گھوڑوں کی ٹاپوں میں باندھ کر چھوڑ دی۔ تفریح نے سنجیدگی کی اور سنجیدگی نے حادثہ کی صورت یہ اختیار کر لی کہ ریس کے رسیا کسی اور میدان میں نظر ہی نہیں آتے۔ جنگ کی صورت حال کیا ہے؟ ہٹلر نے مسولینی کو مارا یا مسولینی نے ہٹلر کو؟ کپڑا ابھی کارڈ میں شامل ہو کر راشن بن گیا۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی کسی دنیا داری سے ان کو کوئی بحث نہیں۔ ان کی مخصوص دنیا کے حالات تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ گلہری نے آج سندباد کو گردن کے فاصلہ سے پیٹ دیا اور گرگٹ کے جاکی نے جان بوجھ کر لگام کھینچ لی ورنہ کوئین آف سندبلہ کا پتہ بھی نہ چلتا۔ مختصر یہ کہ آپ ان سے دنیا کے کسی مسئلہ پر گفتگو کر کے دیکھ لیجئے وُہ ایسے اڑیل ثابت ہونگے کہ گھوم پھر کر گفتگو کا رُخ گھوڑوں کی طرف پھیر دینگے اور دُنیا کے تمام مسائل کا نچوڑ گھوڑ دوڑ کو ثابت کر کے رکھ دینگے۔ ہمارے ہی محلّہ میں ایک میر صاحب رہا کرتے تھے یا تو یہ ہمارے تخیّل کا قصور ہے ورنہ "جمالِ ہمنشیں" والی بات سچّی ہے بہرحال کچھ بھی ہو۔ اس قدر گھوڑوں سے شکل ملتی جلتی تھی کہ ان کی گفتگو پر بعض اوقات ہنہنانے کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ آپ گھوڑ دوڑ کے بہت پُرانے مریض

تھے۔ اس قدر پڑا نے مریض کہ آپ تو خیر گھوڑوں کے فرشتوں تک سے واقف تھے مگر گھوڑے بھی آپ کو پہچان چکے تھے۔ گھوڑ دوڑ کے معاملات میں آپ کی رائے قولِ فیصل کا درجہ رکھتی تھی۔ بڑے بڑے گھوڑ دوڑیے آپ کے اصطبل نما دولت خانہ پر حاضر رہتے تھے اور گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں آپ کے قیمتی مشوروں سے مالا مال ہوا کرتے تھے آپ کے دروازے پر کبھی کسی شاعر، کسی مصوّر، کسی اخبار نویس، کسی سیاست دان، کسی گائک مختصر یہ کہ دنیا کے کسی اور فن سے دلچسپی رکھنے والے کسی آدمی کو کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ کسی ایسے شخص کو آپ قابلِ خطاب سمجھتے تھے جو گھوڑوں کا منکر ہو البتہ ہم کو حیرت یہ تھی کہ میر صاحب کو گھوڑ دوڑ ہی کی طرح مطالعہ کا بھی شوق تھا یعنی جس وقت آپ کے گھوڑ دوڑی احباب موجود نہ ہوتے تھے اس وقت آپ ناک کی پھنگی پر عینک اٹکا کر کتب بینی فرماتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن لگی آگ نہایت شدید، حالانکہ میر صاحب نے پڑوسی ہونے کے باوجود سات سال کے عرصہ میں علیک سلیک تک کے تعلقات نہ رکھے تھے ہم کو بھی مدد کے لئے دوڑنا پڑا۔ اس سلسلہ میں میر صاحب سے تعلقات تو خیر قائم ہی ہو گئے مگر سب سے عجیب انکشاف یہ ہوا کہ جس کو ہم

میر صاحب کی کتب مبنی سمجھتے تھے وہ محدود تھی ریس کی کتابوں کے مطالعہ تک
اس آتشزدگی کے سلسلہ میں اور تو خیر جو کچھ نقصان ہوا وہ ہوا مگر میر صاحب
کے نزدیک ناقابلِ تلافی نقصان یہ تھا کہ پندرہ سال کا ریس کی کتابوں کا
ریکارڈ جل گیا تھا کہنے لگے کہ حضرت روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ مگر یہ جو
زندگی بھر کی کمائی تھی اس کا اب کیا ہو گا ابھی چند دن کی بات ہے مسٹر
جوشی بک میکر ہاتھ جوڑ رہے تھے کہ میر صاحب یہ کتابیں مجھے دے دو مگر میں
نے صاف انکار کر دیا تھا ہم نے کہا "میر صاحب جان کا صدقہ گیا" ایکدم الف
ہو کر بولے "کیا فرماتے ہیں آپ میں نے کبھی کسی نقصان کی پروا نہیں کی۔
ریس میں ہنس ہنس کر ہزار دفعہ ہزاروں کے نقصان برداشت کئے مگر آپ
خود غور کیجئے کہ یہ نقصان کچھ ایسا ویسا نہیں ہے میں تو گویا لُٹ گیا یعنی اس کو
یوں سمجھئے کہ ریس کھیلنا بھی کوئی بچوں کا کھیل ہے۔ حضرت ہم دن بھر دماغ
لڑاتے ہیں سر کھپاتے ہیں۔ ایک ایک بازی کے لئے برسوں کے ریکارڈ کو
نظر کے سامنے رکھنا پڑتا ہے کہ کس گھوڑے نے کتنے ہینڈی کیپ سے کتنے
ویٹ کے ساتھ کونسی ریس ماری ہے یہ نہیں کہ داؤں لگا دیا اندھے کے
ہاتھ کی بٹیر نہیں یہ گھوڑ دوڑ ہے جناب، گھوڑ دوڑ پر جب تک انسان پورا

عبور حاصل نہ کر لے۔ ہر ریس کے ہر گھوڑے کے متعلق اُس وقت تک ریس کا نام بھی نہ لے۔ ذراسی بھول چوک سے نقشہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اب پرسوں ہی ذکر ہے مونا اور الیبلی کے سلسلہ میں یہاں بحث تھی مونا نے چار ریسوں میں ڈیوک کو پیٹا ہے اور ڈیوک پچھلی ریس میں الیبلی کو مار چکا ہے مگر میری قطعی رائے یہ تھی کہ اس ریس میں الیبلی جیت رہی ہے اس لئے کہ اس کا ویٹ کم کر دیا گیا ہے اور مسٹر چوپڑہ مستری اسی پر اڑے ہوئے تھے کہ مونا ہی پھر ریس جیت رہا ہے آخر کار میں نے الیبلی پر ون کا داؤں لگا دیا حالانکہ وہ بہت فیورٹ تھا اور مسٹر چوپڑہ مستری نے مونا پر پلیس کا اور اسی پر ون کا داؤں لگایا۔ اب جناب خدا آپ کا بھلا کرے ریس جو شروع ہوتی ہے تو مونا کا کہیں پتہ تھا نہ الیبلی کا بلکہ رات کی رانی بجلی کی طرح کوندی تھی ساری ریس اپسٹ ہو کر رہ گئی لوگوں نے منہ پیٹ لیا مگر میں نے فوراً اپنی غلطی پکڑ لی کہ اس ریس میں صرف ان ہی دو گھوڑوں پر توجہ کی گئی حالانکہ رات کی رانی بھی دوڑ رہی تھی جس نے پچھلی ریس میں ڈیوک کو مارا تھا اور ڈیوک الیبلی کو جیت چکا ہے ذراسی بھول چوک کا نتیجہ یہ ہوا۔ دراصل ریس اپسٹ نہیں ہوئی بلکہ ہماری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے ریس تو بالکل صاف تھی۔" ہماری

سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ یہ کیا بکواس ہے ورنہ میر صاحب اس شفقت سے گھوڑوں کے یہ نام لے رہے تھے کہ کیا کسی کو اپنے رشتہ داروں کے نام بھی اس قدر یاد ہونگے۔

میر صاحب تو خیر گھوڑدوڑ کے ان کھلاڑیوں میں سے تھے جن کے یہاں ہر گھوڑے کا ایک کھاتہ کھلا ہوا تھا اور اس گھوڑے کے شجرہ سے لے کر اس کی ہر جیت اور ہر ہار کی پوری تفصیل تاریخ وار ان کے پاس محفوظ تھی لیکن لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ میر صاحب کے یہاں اس قاعدہ ہی قاعدہ ہے اگر گھوڑدوڑ کی کامیابی کسی قاعدہ ہی پر منحصر ہوتی تو ان کا یہ حال نہ ہوتا یہ ہمیشہ اپنی قابلیت میں مارے جاتے ہیں اور واقعی ہم نے غور کیا کہ گھوڑدوڑ کے لئے اگر محض اصول ہی ضروری ہوتا تو میر صاحب کے دروازے پر ہاتھی جھومنا چاہیئے تھا۔ جس کے بجائے آج کل ایک جنگبری بکری کھڑی جگالی کیا کرتی ہے۔ مگر میر صاحب کے طفیل میں خود ہم کو ریس کورس جانیکا جو اتفاق ہوا۔ تو ہم نے عجیب عجیب نمونوں کے ریس کے رسیا دیکھے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لوگ محض جیتنے کے خیال سے گھوڑدوڑ جاتے ہیں۔ جی نہیں۔ ایسے بھی اللہ کے بندے پڑے ہوتے ہیں جو یہ طے کرکے جاتے ہیں کہ ہار کر آئینگے چنانچہ وہ ریس کورس پہنچکر پیڈک میں ان ہی گھوڑوں کو تلاش کرتے ہیں۔ جن کو

خوردبین سے دیکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ گھوڑا ہے یا جاکی اور جن کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ اس قسم کے ایک بزرگ سے ہم نے دریافت کیا کہ آپ محض اخلاقی طور پر ان گھوڑوں کی سرپرستی فرماتے ہیں تاکہ وُہ دل شکستہ نہ ہونے پائیں یا کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ ان حضرت نے انگریزی میں جواب دیا No vish No Good یعنی خطرے کے بغیر کوئی بازی بازی ہی نہیں ہے تفصیل میں آکر ارشاد فرمایا کہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ ہار جاؤنگا۔ اس گھوڑے کے جیتنے کا کیا زندگی تک کا اعتبار نہیں لیکن اگر باقی تمام گھوڑے کسی نہ کسی حادثہ کا شکار ہو گئے کوئی گر پڑا۔ کوئی بھڑک گیا۔ کسی کو غش آگیا تو آخر کار اسی گھوڑے کو مجبوراً جیتنا پڑے گا اور ایسی صورت میں ریس کا تمام زرِ نقد میرے قبضہ میں آجائے گا۔ میرا اصول تو یہ ہے کہ میں ریس کے اپسٹ ہونے کی توقع پر کھیلتا ہوں۔ ہارنے سے جو ڈرے وُہ اس طرف کا رُخ ہی کیوں کرے۔ ریس کورس میں ایک بڑی جماعت خبروں پر داؤں لگاتی ہے وُہ نہ کسی اصول پر چلتے ہیں نہ کسی گھوڑے کی ظاہری شکل وصورت پر اعتبار کرتے ہیں۔ وُہ ریس کورس میں آنکھ کے اندھے، گانٹھ کے پورے اور کان کے کچے ہو کر جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انہوں نے کسی جاکی سے یا گھوڑے

کے کسی مالک سے یا ریس کورس کے کسی اور منتظم سے کچھ سُنا لیکے ڈُٹ کی یا ٹُکی کی طرف اور جہاں ان کو ان کا کوئی ہمدرد ملا فوراً اس سے بھی کہہ دیا کہ "جاؤ فوراً بندر یا کے ٹکٹ لے لو"۔ اور اگر اس نے وجہ پوچھی تو بگڑ کر کہا۔ "اماں کہہ دیا کہ جتنے ٹکٹ لینا ہوں چپکے سے لے لو حضور چچا کی نے خبر دی ہے کہ بندر یا جیت رہی ہے"۔ اس نے کہا۔ مگر وہ موٹے سے ٹکی وکیل صاحب کے کان میں کہہ رہے تھے کہ لیڈی نخاس جیتے گی۔ اب تو وہ بھی ذرا چونکے اور روپے نکال کر ان کو دیتے ہوئے بولے "لو بھئی تو میرے بھی دو ٹکٹ لیتے آنا"۔ مگر دراصل یہ خبریں نہ تو غفور چچا کی نے کسی گھوڑے سے سُنی تھیں نہ موٹے سے ٹکی سے کسی گھوڑے نے کہا تھا کہ میں جیت رہا ہوں۔ یہ سب عقلی گدے تھے مگر اتفاق سے ان ہی گھوڑوں میں کا کوئی گھوڑا آ گیا تو کیا کہنا ہے ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ خبر جھوٹی نکلی اور آخر میں پھر قسمت ہی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو نہ اصول کے قائل ہیں نہ کسی خبر پر کان دھرتے ہیں بلکہ شروع سے آخر تک گھوڑ دوڑ کو قسمت ہی کا کھیل سمجھتے ہیں ان کے دیس کھیلنے کے طریقے ذرا مختلف ہوتے ہیں وہ گنڈے تعویذ کراتے ہیں گھوڑوں کی تسخیر کے منتر پڑھواتے ہیں۔ رمالوں سے پوچھتے ہیں۔ نجومیوں

سے دریافت کرتے ہیں ہتھیلی کی لکیروں میں دیکھتے ہیں کہ کونسا گھوڑا دوڑ رہا ہے یہ حضرات شگون اور بدشگونی کے بیحد قایل ہوتے ہیں گھر سے چلیں تو گھر والے دہی مچھلی ضرور رکھیں دروازے سے نکلیں تو کوئی عورت۔ کوئی بلّی کوئی یک چشم نہ ملے۔ کسی کو چھینک نہ آنے پائے۔ ریس کورس میں پہلے وہی قدم رکھیں گے جس طرف کے نتھنے سے سانس آرہی ہو۔ پیڈاک میں گھوڑے پر نہ جانے کیا کیا پڑھ کر دم کرتے رہیں گے اور گھوڑا دُم ہلاتا رہیگا۔ اب اگر وہ گھوڑا جیت گیا تو نجومی بھی سچّا تھا اور منتر بھی حکمی اگر ہار گیا تو اب یہ غور کر رہے ہیں کہ صبح کس کی صُورت دیکھ کر اُٹھے تھے۔ گھر سے نکلے تھے تو سب سے پہلے سامنے کون آیا تھا۔ راستہ میں کن کن حضرت سے ملاقات ہوئی تھی۔ یعنی ان کی ہار میں نہ گھوڑے کا قصور ہوتا ہے نہ جاکی کی کوئی خطا بلکہ اس ناکامی میں کوئی نہ کوئی بدشگونی ضرور ہوتی ہے۔ بہت سے کھیلنے والے بزنس کے طور پر کھیلتے ہیں اور خالص تجارتی اصول کے ماتحت جیت کو نفع اور ہار کو نقصان سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات مُلک کے ہر گوشہ میں ریس کھیلنے جاتے ہیں ریس کے لئے ان کا باقاعدہ بجٹ ہوتا ہے اور بجٹ میں خسارے یا اضافے کے مکمل حسابات ان کے پاس رہتے ہیں اس لئے کہ یہ کوئی کھیل تو ہے نہیں تجارت

بہر حال تجارت ہے۔ کھیلنے والوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو محض کھلنڈرے پن کے ساتھ ریس کورس جاتے ہیں۔ احباب کے ساتھ ہنسی مذاق کا لطف رہتا ہے اور لگے ہاتھ ایک آدھ بازی بھی لگا دیتے ہیں۔ جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے ریس کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس قسم کے لوگ ریس کی اہمیت کو نہ کبھی سمجھے ہیں اور نہ کبھی سمجھ سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ریس کورس میں ایک عجیب دنیا نظر آتی ہے۔ بھانت بھانت کے انسان مگر سب کی نیت میں ایک ایک گھوڑا ٹھہرا ہے۔ مختلف مگر سب کے سب گھوڑ دوڑ کے نشہ میں مست، گھوڑوں کا ذکر گھوڑوں کی فکر۔ گھوڑا دل ہیں، گھوڑا نظر میں اور روح اٹکی ہوئی گھوڑے میں مگر گھوڑ دوڑ والوں کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو گھر گھوڑا، نخاس مول کی قایل ہے یعنی گھر بیٹھے گھوڑے پر داؤں لگا دیا اور شام کو نتیجہ سن لیا کہ کیا ہوا۔ مگر یہ گھریلو ریس کے رسیا ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔

مگر نہ جانے کیوں ہم ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی ریس کورس نہیں گئے البتہ گھوڑوں کے دیکھا دیکھی جب شکاری کتوں نے دوڑنا شروع کیا تھا تو گرے ہاؤنڈ ریس کا چسکا ہم کو بھی پڑا تھا۔ گھوڑے کے تو خیر لگام بھی ہوتی ہے اور اس کو کھینچنے والا جاکی بھی مگر کتے تو بالکل ہی قسمت سے دوڑتے ہیں نہ ان پر

کوئی سوار، نہ ان کو کوئی ہنکانے والا۔ نقلی خرگوش کے پیچھے جی بھر آباد وڑے ورنہ دُم ہلا کر زیادہ سے زیادہ بھونک کر رہ گئے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ اکثر یہ کُتّے ستم ظریفیاں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کُتّا جس کا ٹکٹ ہمارے پاس تھا۔ گز دو آگے بجلی کی طرح آتے آتے یکایک ٹھہر گیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا اور غالباً اپنے سے کم مرتبہ کتوں کے ساتھ دوڑنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر وہیں سے واپس چلا گیا۔ دوسری مرتبہ ایک کُتّا ہمارے ٹکٹ والے کتّے کے ساتھ ساتھ آخر تک آیا اور آخر کار جج صاحب نے فیصلہ یہ دیا کہ دوسرے کتّے نے زبان نکال کر بازی جیت لی۔ گھوڑ دوڑ کچھ بھی سہی مگر کم سے کم کوئی گھوڑا دوڑتے دوڑتے واپسی کا ارادہ تو نہ کرتا ہوگا اور نہ کسی گھوڑے کی زبان درازی بس کو ربس جتا سکتی ہوگی۔

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم ہ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تُل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے

والدین یتیم نہیں ہوتے۔ لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کردی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دیگا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ریاضؔ بیچارے اپنے لئے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ اُن کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وُہ واقف نہ تھے اس لئے کہ وُہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دُنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہٰذا اُن کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لئے اُن سے جُدا کر دیا تھا۔

ریاضؔ کے والدِ ماجد کا انتقال خود اُن کے لئے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مُبتلا نہ تھے اس لئے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاضؔ کے پاس تعزیت کے لئے جانا تھا۔ اُن سے اظہارِ ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدمِ شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ میں

کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کرلیں۔ بہرحال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہونگے۔ اس لئے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لئے آچکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لئے کہ خود ہم نے بہ نفسِ نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے کو پختہ کرلیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ ذہن پر زور دے کو یکجا کرنا شروع کر دیئے۔

"مشیّت ایزدی میں کیا چارہ ہے —— صبر کیجئے —— جس کی چیز تھی اُس نے لے لی —— دُنیا کا یہی دستور ہے —— مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ کیا علیل ہوئے تھے؟ ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے —— آج وہ، کل ہماری باری ہے —— خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جُدا ہو گئے —— کوئی نشانی بھی چھوڑی

ہے "این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" —— مگر صبر کیجئے ——
اب رونے سے کیا ہوتا ہے —— ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے ——
دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش —— کبھی
نماز قضا نہیں کی —— خدا نعم البدل دیگا —— اپنے دل کو سنبھالئے ——
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے —— حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ——
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں —— ابھی تو نہ تھے اُنکے مرنیکے دن
آلٰہی عاقبت محمود گرداں —— چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ ——

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لئے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا۔ لٰہذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "اکسپرٹ" ہو گئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ تمام راستہ بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی۔ ——

"مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی، واللہ دل کو یقین نہیں آتا، عجیب سانحہ ہے
عجیب حادثہ ہے، خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں
جگہ دے، کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش کبھی نماز قضا نہیں کی ——
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجئے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا ——
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اُس نے
لے لی —— ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" —— صبر کا پھل میٹھا
ہوتا ہے، روحیں آزاد نہوں جسم جو برباد نہوں، ابھی تو نہ تھے اُنکے مرنیکے دن
مرینگے تو سانچے میں ڈھل جائینگے، وُہ تو جنّت کا اک پھول تھے ——
حوروں کی گود میں ہوں گے۔ نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق
دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچّے، فرشتہ صفت، محبّت کرنے والے
لائق، پڑھے لکھے، فخر خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ
کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے۔ مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ
کام آتا۔ مٹی دینے میں شرکت کرتا۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہوجاتا، مگر افسوس کہ
آج وہ، کل ہماری باری ہے" چلیئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السّلام علیکم

ریاض کے دروازے پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "کھولے جائیے" کی آواز دیں لیکن یاد آگیا کہ موقع غم کا ہے، فوراً اپنا چہرہ اُداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا۔ "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"

انہوں نے اس کے جواب میں "وا لے کم۔ اس سالام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا۔ لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا ہم تعزیت کے لئے آئے تھے۔ لہذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی۔ لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے۔ لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اُس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے۔ جب اسی میں بڑی دیر ہوگئی۔ تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے

ہیں، مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیئے۔ جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہو گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں؟ کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آ کر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا "لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لئے آئے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بُت سے بنے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سرِ نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپکے والد ——— پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آ گیا تو عرض کیا :۔

"آپکے والد ——— ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ :۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد ———

خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا۔ لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد —— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اُس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سنائی ہے۔ مَیں پھر خاموش ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیئے۔ لہذا مَیں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیّت ایزدی میں کیا چارہ ہے، صبر کیجئے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد —— آپ کے والد —— آپ کے والد تھے —— جس پہ گذری ہو بس وہی جانے مگر اب نہ روئیے —— جانے بھی دیجئے —— ہٹایئے بھی اس قصّہ کو —— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے

خاموش ہوگیا تھا اور گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سُن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اُٹھا کر میرا مُنہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا :—

باپ بھی دنیا میں عجیب نعمت ہیں، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہونا ہی اچھا ہے"۔

ریاض برابر میرا مُنہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جُملہ کا اُس پر خاص اثر ہوا اُس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

اب وُہ واپس تو نہیں آ سکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچ جانا، یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے، خدا بخشے عجیب انسان تھے، دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وُہ کل ہماری باری ہے۔ ورنہ مجھ کو

اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہو گی"۔

ریاض نے منحنی آواز میں جواب دیا:۔

"جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔

میں "خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دیگا۔ اور قبر کا کیا ہوا ہو گا؟

ریاض "عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی"۔

میں۔ ہاں واقعی اور تم بیچارے کیا کرتے، تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہونگے، دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا' اور بیماری کیا تھی"؟

ریاض "۔ ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے"۔

میں "۔ ہاں صاحب بڑی مہلک بیماری ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کمبخت اب تو عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔ غم کا پہاڑ پھٹ پڑا "بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں" اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی"؟

ریاض "۔ ایک تو میں ہی ہوں"۔

میں (جلدی سے) "تم تو خیر ہو ہی۔ مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں۔ ارے

ہاں کیا تعجّب ہے؟"

ریاض "جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے"۔

مَیں۔ "وہی مطلب ہے میرا، اور اُن کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟"

ریاض "جی ہاں میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

مَیں۔ "اُن کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجئے اور آپ کے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟"

ریاض "سو سے کوئی پانچ چھ سال اُوپر تھے"۔

مَیں۔ "افسوس صد افسوس۔ ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

ریاض نے مجھ کو کچھ اِس نظر سے دیکھا گویا میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنّع ہے۔ مگر مَیں نے مؤثر انداز میں کہا۔

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے اور محبت کرتے تھے"۔

ریاضؔ:- "جی ہاں اُن کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔"

میںؔ:- "ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں۔ خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے۔ ہر ایک خوش۔ کبھی نماز قضا نہیں کی۔ ابھی تو نہ تھے اُن کے مرنے کے دن۔ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟"

ریاضؔ:- "جی ہاں اب تمام ذمّہ داری میرے ہی سر ہے۔"

میںؔ:- "گھبرایئے نہیں جس خدا نے ان کو اُٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کریگا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذات شریف تھے مرحوم کبھی نماز قضا نہیں خود ان ہی کی قضا آگئی۔ ع۔

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے، دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟"

ریاضؔ:- "جی ابھی تو نہیں ہوئی۔"

میںؔ (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) "بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔"

ریاض: "اس کا یہ کونسا موقعہ ہے بھلا؟"

مَیں: "تو اب اور کون سا موقعہ آئے گا۔"

ریاض: "اب خوش ہونے والا کون ہے جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی"۔

مَیں: "ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیئے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دُنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جس کی چیز تھی اُس نے لے لی۔ مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں"۔

اگر پدر نتو اند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ۔ ع۔

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بیچارے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی نا کہ بس قضا آ گئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مر جائینگے؟ مگر خدا کی مصلحت' اور تقدیر تو وہ جان دینے تھے اب تم کہ کون اس طرح چاہے گا۔ تمہارا محبت کرنے والا اُٹھ گیا۔ تم یتیم ہو گئے۔ تم پر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ ع۔

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہو چکے۔ کیا اُن ہی کو پھر سے شروع کر دوں، لیکن اگر انہوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہو گا۔ آخر کار دل نے کہا۔ بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہو گا۔ مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو لہذا ہم نے کہا :-

"بھائی رونے کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاءاللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ تم کو سمجھ سے کام لینا چاہئے۔"

ریاض کی ہچکیاں، سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ "اچھا بھائی اب اجازت دو۔"

ریاض نے کہا "جائیے گا" ہم نے کہا "ہاں۔ السلام علیکم۔"

ریاض کے یہاں سے آ کر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسن کے یہاں کبھی تعزیت کے لئے روز نہ چلا جایا کروں۔

سناؤں تمہیں بات اک رات کی

"واللہ میں بزدل نہیں ہوں نہ لکھنؤ میرا وطن ہے بلکہ میرا تعلق تو اس خاندان سے ہے جس کی بہادری کے افسانے آج تک بزدلوں کو بہادر بنانے کے کام آتے ہیں لیکن بعض واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی لرزہ براندام ہو جائے بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جو واقعہ ہم پر گذرا ہے اگر کسی اور بہادر انسان پر گذرتا تو شاید وہ دہل کر مر جاتا یا سہم کر عرصہ تک اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا رہتا لیکن ہم نے اس آزمائشی اور امتحانی موقع پر اپنے ہوش و حواس کو اس حد تک قائم رکھا کہ نہ تو خوف کی

وجہ سے دم نکلا اور نہ اختلاجِ قلب کی شکایت مستقل طور پر پیدا ہوئی البتہ گھگی ضرور بندھ گئی تھی بجبر یہ کوئی ایسی بزدلی کی بات نہیں۔

قصہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں مسلح ڈاکوؤں کی کثرت نے ایک تو یونہی سب کو ڈرا رکھا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کسی اللہ کے بندے نے ایک خط بھی ہم کو بھیجدیا کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو ایک ہزار روپیہ ہماری نذر کر دو، ورنہ مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ، اس خط کو دیکھ کر پہلے تو تھوڑی دیر کے لئے ہم کو بھی محسوس ہوتا رہا کہ واقعی قلب کی حرکت بند ہونے والی ہے لیکن پھر ہم نے اس بزدلی پر دل ہی دل میں خود ہی اظہارِ تنفر کیا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ خط لے کر بیگم کے پاس پہنچے تا کہ ان کو بھی یہ الٹی میٹم دکھا کر خطرہ کے لئے تیار کر دیں لیکن بیگم ٹھہریں عورت، ان کا خط دیکھتے ہی گویا دم نکل گیا، ایک دم سے زرد پڑ گئیں اور ڈرتے ڈرتے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ "پھر؟"

ہم نے مہا درانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "پھر کیا دیکھا جائیگا۔"

بیگم نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ "دیکھا کیا جائیگا؟ مجھ کو اور بچوں کو لے کر آج ہی زرد کوٹھی چلئے میں اب یہاں ایک منٹ نہ ٹھہرونگی۔"

ہم نے بیگم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہیں آج ہی تمام زیور اور روپیہ بنک میں رکھوائے دیتا ہوں اور ایک پہاڑی بندوقچی پہرہ دینے پر نوکر رکھے لیتا ہوں"۔

بیگم نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا :۔

"اس سے کیا ہوگا اگر ڈاکوؤں کو روپیہ نہ ملا تو وُہ جان لیں گے بنک میں روپیہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا"؟

ہم نے کہا۔ "مگر بنک میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اور بچوں کو بھی وہیں رکھوا دوں، ہم سب کی حفاظت خدا کریگا۔

بیگم ہیں ذرا مذہبی قسم کی آدمی، خدا کا نام سُن کر دل سے نہ سہی، مگر اخلاقاً اس انداز سے چُپ ہوگئیں کہ گویا اطمینان تو نہیں ہوا ہے مگر مجبوری کا نام شکر ہے۔ بہرحال ہم واقعی صرف یہی کر سکتے تھے کہ روپیہ اور زیور بنک میں رکھوا دیں اور پہرہ دار نوکر رکھ لیں، اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی کیا کہ وُہ دہشت انگیز خط جو ہم کو موصول ہوا تھا پولیس میں بھجوا دیا اور اس کے بعد اپنے کو مع بال بچّوں کے خدا کو سونپ کر بیٹھ رہے۔

جس روز کا یہ واقعہ ہے اُس دن چراغ میں بتّی پڑتے ہی ہمارا تمام

گھر مقفّل کر دیا گیا، پہرہ دار خاص ہمارے کمرے کے دروازے پر تعینات کر دیا گیا اور کمرے کے اندر بھی یہ انتظام تھا کہ خود ہماری چارپائی پر توشک کے نیچے بندوق تھی اور تکیہ کے نیچے کارتوس، بیگم نے اپنے دونوں بچّوں کو اُن کے بستروں کے بجائے خود اپنے پاس لٹایا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ تمام رات کوئی نہ سوئے گا۔ حالانکہ بغیر طے کئے بھی نیند کا آنا ذرا مشکل ہی تھا۔ بہرحال شام ہی سے ہم سب اس طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھ گئے کہ گویا کسی کی آمد آمد ہے۔

رات کا ابتدائی حصّہ بخیریت تمام گزر گیا اور ۱۲ بجے رات تک سڑک پر آدمیوں کی اور سواریوں کی آمد و رفت سے چہل پہل رہی لیکن اس کے بعد سنّاٹا ہونے لگا یہاں تک کہ ایک ہُو کا عالم ہو گیا، رات کی بھیانک تاریکی اور وحشت ناک سنّاٹا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب کو نگل جائیگا اور بغیر ڈکار لئے ہضم کر جائیگا، اس وقت گویا ہم تاریک رات کے بھیانک سیاہ دیو کی آغوش میں تھے کہ جب وہ چاہے ہم کو اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لے، اس خوفناک سکوت کو اس طرح توڑا جا سکتا تھا کہ ہم بیگم سے باتیں کرتے اور بیگم ہم سے لیکن دونوں اس قیمتی وقت کو فضول بک بک میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ

اپنی اپنی جگہ پر یہی سوچ رہے تھے کہ جب ڈاکو آئیں گے تو ہم ان کا خیر مقدم کس طرح کرینگے، جب وہ ہم کو پستول دکھائیں گے تو ہم کس طرح ہاتھ اٹھا کر اعلانِ شکست کریں گے اور جب وہ ہم سے روپیہ طلب کرینگے تو ہم کس طرح اپنی ناداری اور مفلسی کا ان کو یقین دلائیں گے پھر اگر خدانخواستہ ان ظالموں نے ہم کو قتل وغیرہ کیا تو کیا ہوگا۔"

پہرہ دار نے نہایت ڈراؤنی آواز سے کہا۔ "ہاہ —— ہو"

ہم تو خیر چھ سات انچ اچھلے ہونگے کہ بیگم غڑاپ سے لحاف کے اندر گھس گئیں اور سانس روک کر رہ گئیں اس حماقت کا احساس ۵ منٹ بعد ہم کو اور سات منٹ بعد ان کو ہوا مگر اس کے باوجود نہ تو ہنسی آئی اور نہ دونوں میں سے کسی نے اس پر کوئی تبصرہ کیا بلکہ پھر اس طرح بیٹھ گئے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یعنی سکوت کا یہ عالم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن نہایت صاف سن رہے تھے اور ذرا ذرا سے کھٹکے پر یہ آواز اور بھی تیزی کے ساتھ ڈبل مارچ کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی، ہم نے اس مہمل بزدلانہ خاموشی پر خود

ہمیں جو غور کیا تو کچھ شرم سی آنے لگی۔ لہٰذا یہ طے کیا کہ کوئی کتاب پڑھ کر یہ وقت ٹالا جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کتاب تھی میز پر اور چارپائی تھوڑے فاصلہ پر لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نازک موقع پر ہم چارپائی سے اٹھتے اور میز تک جا کر وہاں سے کتاب لاتے اور فرض کر لیجئے کہ ہم اس طرح اپنے کو خطرے میں ڈال بھی دیتے لیکن اگر اسی وقت کوئی آجاتا تو بڑی مشکل ہوتی۔ لہٰذا یہ ارادہ ملتوی کرنا ہی پڑا اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ بیگم سے باتیں کریں چنانچہ اس اسکیم کے نشیب و فراز پر خاموشی کے ساتھ خوب اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر چپکے چپکے باتیں کی جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں لہٰذا تھوڑی دیر تک ارادہ کرنے کے بعد ہم نے کہا :-

"بیگم"

بیگم نے زیر لب کہا "ہوں"

ہم نے کہا "جاگ رہی ہو نا؟"

بیگم نے پھر اسی طرح بغیر منہ کھولے ہوئے کہا "ہوں"

ہم نے چپکے سے کہا۔ "ڈرنا نہیں ہم جاگ رہے ہیں۔"

بیگم نے اس کا جواب دینا کچھ ضروری نہیں سمجھا اور ہم بھی سوچنے لگے

کہ اب کیا کہیں کیونکہ ہم کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ہی نہ رہی اس لئے کہ چار پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ کتّوں نے آواز ملا کر خوفناک طریقہ پر بھونکنا شروع کیا اور ان کے بھونکنے سے قدرتی طور پر ہم کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے غالباً یہی فیصلہ بیگم صاحبہ نے بھی کیا، اس لئے کہ چپکے سے انھوں نے پوچھا:-

"کتّے کیوں بھونک رہے ہیں"؟

ہم نے کہا "معلوم نہیں"۔

بیگم نے کانا پھوسی کے انداز سے پوچھا "چوکیدار سو گیا"؟

ہم نے رازدارانہ طریقہ پر جواب دیا "معلوم نہیں"۔

بیگم نے کہا "اس کو آواز دیجئے"۔

ہم نے کہا "ابھی چپ رہو۔ کتّے ذرا چپ ہو جائیں"۔

مگر سوال یہ تھا کہ کتّے واقعی کیوں بھونک رہے ہیں یقیناً انھوں نے کسی اجنبی آدمی کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا تعجب ہے کہ وہ آدمی ڈاکو ہو۔ اب خطرہ نزدیک تھا اور خطرہ کے نزدیک ہونے کی یہ علامت بھی پائی جاتی تھی کہ ہمارے دل کی حرکت سول سروس کپ کی ریس بن گئی

تھی اور ہاتھ پیر ذرا کانپ رہے تھے۔ کتّے بدستور بھونک رہے تھے بلکہ بھونکتے ہوئے عین ہمارے مکان کے سامنے آ گئے تھے کہ ناگاہ

"آہ ——— ہاؤ ——— ہاہاہا"

اب کے ہم بھی سجدے میں گر پڑے اور معلوم نہیں "اوئی" کہہ کر بیگم کا کیا حشر ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد آواز آئی :-

"جاگتے رہو"

ہم بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور بیگم بھی لیکن کتّے بدستور قیامت برپا کئے ہوئے تھے بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر کہا :-

"یہ کُتّے کیوں بھونکے جاتے ہیں"؟

ہم خود ہی اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ آخر ہم نے ہمّت کر کے چوکیدار کو چپکے سے پکارا اور پوچھا کہ "یہ کتّے کیوں بھونک رہے ہیں"؟

اس نالائق نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "ان کا اور کام ہی کیا ہے"؟

ہم نے اس مہمل جواب سے جل کر مگر خوشامدانہ انداز سے کہا :-

"پھر بھی آخر بات کیا ہے"؟

اس بہاڑی گدھے نے پھر وہی مہمل جواب دیا کہ "حضور اگر وہ بھونکیں نہ

تو کُتّا ان کو کون کہے"؟

ہم جل بھُن کر چُپ ہو رہے اس لئے کہ زیادہ بات چیت کرنا بھی موقع اور محل کے اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ لیکن کُتّوں کا بھونکنا یقیناً بلاوجہ نہیں ہو سکتا اور پھر عین ہمارے دروازہ پر کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی بہرحال ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنا کانپتا ہُوا ہاتھ چپکے سے اُٹھا کر بستر پر اس جگہ رکھ لیا جہاں بستر کے نیچے بندوق رکھی ہوئی تھی مگر اب ہم کو معلوم ہُوا کہ بندوق اس قسم کے موقعوں کے لئے بالکل بیکار چیز ہے اس لئے کہ اس کمبخت کے لئے یہ ضروری بات ہے کہ اس کو چلایا بھی جائے تو چلے اور یہاں سوال یہ درپیش تھا کہ آخر چلائی کس طرح جائیگی اور کس طرف سے چلائی جائیگی، ہماری نشانہ بازی مسلّم، ہماری بندوق بازی کی مہارت تسلیم لیکن جناب ڈاکو کوئی ہرن، یا نیل گائے، کوّا، یا تیتر تو تھے نہیں کہ خاموشی سے گولی کھا کر ڈھیر ہو جاتے۔ یہاں تو برابر کا مقابلہ تھا کہ ایک گولی تم چلاؤ تو دس گولیاں ادھر سے چلائی جائیں گی، پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بندوق بھی بھری ہوئی نہیں تھی بلکہ بغیر بھری ہوئی چارپائی کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی اور کارتوس تکیہ کے نیچے تھے۔ اس کے یہ معنی ہُوئے کہ پہلے

بندوق بستر کے نیچے سے نکالی جائے پھر اس میں تکیہ کے نیچے سے کارتوس
نکال کر بھرے جائیں اس کے بعد اگر گھوڑا انگلی سے دب سکے تو بندوق
چھوٹ سکتی ہے ورنہ نہیں۔ استغفراللہ یہ بھی کوئی تفریحی شکار تھا کہ اس قدر
اہتمام کے بعد بندوق چلائی جاتی، مجبوراً ہم نے بندوق پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور
دراصل یہ ہماری ایمانی کمزوری بھی تھی کہ خدا کو بھول کر بندوق سے کوئی توقع
رکھتے چنانچہ بندوق سے مایوس ہو جانے کے بعد ہم نے اپنے ذہن میں
سوائے خدا کے اور کسی کو نہ رکھا اور واقعی اس خیال کے آتے ہی اس قدر
تقویت پیدا ہو گئی کہ ہم نے آزادی سے منہ کھول کر سانس لینی شروع کر
دی اور اس وقت پہلی مرتبہ داڑھ میں دبے ہوئے پان کو بھی چبایا بلکہ ایک
آدھ ڈگری بیگم کو بھی گردن گھما کر دیکھا کہ کس حال میں ہیں وہ اللہ کی بندی
دروازے پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھی کہ گویا اب دروازہ کھلا اور
اب کوئی آیا، خیر یہ تمام صورتیں تو جس طرح ہو سکتا تھا برداشت کی جا
رہی تھیں مگر اس مصیبت بالائے مصیبت کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آرہا
تھا کہ اسی نازک موقع پر پیشاب نے بھی ستایا یہ دراصل ہماری ہی حماقت
کا نتیجہ تھا کہ مغرب کے بعد ہی پیشاب کر کے چارپائی پہ آ گئے تھے ورنہ اگر

ہم نے اوّل حصّہ شب کے سنّاٹے میں ایک مرتبہ اور اس طرف سے فراغت کر لی ہوتی تو اس وقت اس مصیبت کا سامنا نہ ہوتا، چارپائی سے اُتر کر غسل خانہ تک یا کم از کم ناب دان تک جانا اور وہاں اس بھیانک رات کے سنّاٹے میں بیٹھ کر تنہا پیشاب کرنا ظاہر ہے کہ ایک ناممکن اور ناقابلِ عمل سی بات تھی، یہی ایک صورت تھی کہ پیشاب کو روکا جائے لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ وہ تمام تدابیر عمل میں لائی جا چکی تھیں جو اس قسم کے مواقع پر پیشاب کو روکنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں، اتفاقاً عین اسی موقع پر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہم نے غسل خانہ جانے کا ارادہ بھی کیا تو بیگم خود ہی ہم کو نہ جانے دیں گی اور اگر ہم گئے بھی تو وہ خود ہمارے ساتھ بیٹھیں گی، بہر حال دونوں صورتوں میں ہمارا مقصد حل ہوا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے بیگم سے کہا "سنتی ہو۔"

بیگم نے چپکے سے کہا "کیا ہے؟"

ہم نے کہا "پیشاب۔"

بیگم نے اس اہم مسئلہ کو کوئی معمولی سی بات سمجھ کر کہا "اونھ ہوگا بھی۔"

ہم نے کہا "بڑے زور سے معلوم ہو رہا ہے بس اب نکلنے ہی والا ہے"

بولیں "تو جاؤ پھر"۔
ہم نے حیرت سے کہا "اور تم ڈرو گی تو نہیں؟"
بیگم نے کہا "اگر اس وقت یہیں کر لو تو کیا ہرج ہے؟"
ہم نے اخلاقاً کہا "یہاں؟ یعنی کمرے کے اندر؟ اجی نہیں برا معلوم ہوتا ہے"۔
بیگم نے کہا "ہو گا بھی، صبح کمرہ دھل جائیگا"۔
ہم نے پھر کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ بیگم ہمت کر کے ہم کو باہر جانے کی اجازت دے دیتیں اور اس کا بھی امکان تھا کہ ناگہانی طور پر یہ ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لہذا ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے شانشین کا مصدر گردانا شروع کیا مگر کیا عرض کیا جائے کہ عین اسی موقع پر
"اے ــــ خاہ ــــ ہوہاؤ ــــ خبردار"
کی فلک شگاف بھیانک آواز نے ہم کو مجبور کر دیا کہ پیشاب کا سلسلہ غیرارادی طور پر باقی آئندہ کرتے ہوئے جوں کے توں ڈھلک کر لحاف کے اندر گھس رہے اور جب کچھ دیر کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ پہرہ دار نے اپنا فرض

انجام دیا تھا تو ہم نے بھی لیٹے ہی لیٹے ازار بند کس لیا اور پیشاب کی دوسری قسط بھی ادا کرنے کا خیال نہ رہا۔ اس وقت تقریباً ڈھائی بجے تھے اور ڈاکوؤں کے انتظار کے باوجود نیند کا بھی غلبہ تھا بلکہ بیگم تو شاید بیٹھے ہی بیٹھے اونگھ بھی رہی تھیں مگر ہم سونا نہیں چاہتے تھے اس لئے کہ اگر اس وقت سونے کا ارادہ کرتے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید پھر حشر سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی، مانا کہ پہرہ دار جاگ رہا تھا وہ اسی لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ ہم اطمینان سے سوئیں اور وہ جاگتا رہے لیکن انسان ہی تو تھا اگر وہ بھی سو جاتا اور ڈاکو اتفاق سے آجاتے تو ظاہر ہے سیدھے ہمارے سینہ پر چڑھ جاتے اس وقت کیا ہوتا؟ اس خیال سے ہم جاگتے رہے بلکہ زبردستی جاگتے رہے جمائیاں آتی رہیں، انگڑائیاں لیتے رہے لیکن سو جانا خطرناک تھا البتہ چونکہ آنکھ بند کرنے میں ذرا لطف آتا تھا لہذا کبھی کبھی ایک ایک سیکنڈ پھر چار چار سیکنڈ۔

"پھر ——— پھر ——— پھر ——— خر خر خر"

غالباً ابھی آنکھ لگی تھی کہ ڈاکو موقع پا کر چڑھ بیٹھا اور ہم اُچھل کر جاگ پڑے، ڈاکو ہم پر لدا ہوا تھا اور ہم کلمہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے

تھے، سانس تک روک لی تھی۔ آنکھیں بھینچ کر بند کر لی تھیں اور زندگی کی اس آخری کشمکش پر موت کو ترجیح دے رہے تھے کہ یکایک ڈاکو نے کہا "او، او، او، او، او، او"۔ اور ہم نے بھی غیر ارادی طور پر اس کی آواز سے آواز ملا کر کہنا شروع کیا۔ "او، او، او، او"۔ ہم لحاف کے اندر سے اور ڈاکو لحاف کے اوپر سے اسی متواتر اور مسلسل او، او میں مصروف تھے بلکہ دونوں بچے بھی غالباً جاگ کر اس آواز میں شریک ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ نہایت مہین اور باریک آوازیں بھی اس راگ میں شامل تھیں البتہ پہرہ دار نہایت کرخت آواز میں "کیا ہے، کیا ہے؟" کا شور بلند کئے ہوئے تھا آخر کار وہ دروازہ کھول کر کمرہ میں گھس آیا، پہلے تو زبانی "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کرتا رہا حالانکہ اندھا دیکھ رہا تھا کہ ڈاکو ہم پر سوار ہے۔ آخر کار ڈاکو کو ہم پر سے ہٹا کر کہا:۔

"بیگم صاحبہ چپ تو ہوئیے آخر ہوا کیا؟"

اب ذرا ہماری بھی گھگی پنچم سے مدھم کے سروں پر آئی اور رفتہ رفتہ خاموش ہوئے، لحاف ہٹا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ پہرہ دار کے پاس بدحواس کھڑی تھیں اور پہرہ دار دونوں بچوں کو اٹھائے ہوئے تھا۔ پہرہ دار نے

ہم سے پوچھا "حضور آخر ہوا کیا؟"

ہم نے ہانپتے ہوئے کہا "ڈاکو مجھ پر چڑھ بیٹھا تھا"

بیگم نے کہا "نہیں ڈاکو نہیں، میں آپ کے پاس آئی تھی۔ ڈاکو تو باورچیخانہ میں جاکر برتن سمیٹ رہا تھا"

پہرہ دار نے فوراً لالٹین اٹھا کر باورچی خانہ میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو نے سوائے اس کے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ دودھ کی پتیلی گرا کر دودھ پھینک دیا اور پھر اس کو چاٹ بھی گیا۔

پہرہ دار نے کہا "واہ، واہ، واہ"

بچے ہنس دیئے۔

بیگم نے کہا "توبہ ہے اللہ"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ اب کے یہ حرامزادی بلی آئی تو گولی مار دوں گا"

اس کے بعد مرغ اذان دے رہا تھا اور ہم سو رہے تھے۔

پارٹی بازی

لوگوں کو عجیب عجیب چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی صاحب دیا سلائی کے لیبل جمع کر رہے ہیں تو کوئی ڈاک کے ٹکٹ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کو وزیٹنگ کارڈ جمع کرنے کا خبط تھا اور خود ہم کو مختلف کمپنیوں اور دکانوں کے بل جمع کرنے کا مراق ہے تاکہ جب ہماری فاقہ مستی رنگ لائے تو ہم یہ کہہ سکیں کہ ۔۔۔

قرض کی پیتے تھے مے اور پھر یہ کہتے تھے کہ ہاں

مگر ان سب سے زیادہ عجیب و غریب شوق ہمارے ایک اور دوست کو

تھا جو دعوت ناموں کا نہایت نادر ذخیرہ جمع کئے ہوئے تھے۔ ان کی الماریوں میں خدا جانے کتنے البم دعوت ناموں کے بھرے پڑے تھے اور ان دعوت ناموں کو دیکھ کر خدا کی شان نظر آتی تھی کہ یہ شخص اتنا کھانے کے بعد مر کیوں نہیں گیا۔ ٹی پارٹیاں، لنچ، ایٹ ہوم، گارڈن پارٹیاں، ڈنر، افطار پارٹیاں، کاکٹیل پارٹیاں اور خدا جانے کن کن پارٹیوں کے بیشمار دعوت نامے موجود تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافوں پر اضافے ہو رہے تھے اس لئے کہ معدہ ساتھ دے رہا تھا۔ پارٹیوں کی شرکت نہایت پابندی کے ساتھ اپنے اوپر فرض کر لی تھی اور دعوتوں کی خوشبو سونگھنے میں ناک بلا کی تیز تھی۔ آندھی آئے یا طوفان کوئی مرے یا جئے۔ لیکن اگر کہیں سے دعوت نامہ آگیا ہے تو سو کام ایک طرف اور اس دعوت کی شرکت ایک طرف، ان کا شریک ہونا موت کی طرح برحق، دراصل ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ پارٹیاں اور دعوتیں نظر آتی تھیں اور اگر سچ پوچھئے تو ان کو ایک مستقل دفتر کی ضرورت صرف ان پارٹیوں کے لئے تھی کہ دفتر کا ایک کلرک ان دعوت ناموں کو رجسٹر پہ چڑھائے اور تاریخوار دعوتوں کا پروگرام مرتب کرکے ہر روز صاحب کے سامنے پیش کر دیا کرے ایک کلرک دعوت ناموں کے جواب دیا کرے اور دعوت ناموں کا ریکارڈ

مرتب اور منظم رکھتے مگر ان حضرت نے اس پورے دفتر کا کام بھی اپنے ہی ذمہ رکھا تھا کہ دعوت نامہ آیا۔ آپ نے ڈائری پر اس کی تاریخ اور وقت نوٹ کر لیا۔ شرکت کے وعدے کا خط لکھ دیا اور دعوت نامے کو البم میں چپکا دیا۔ اب ہر روز ڈائری دیکھتے کہ آج ۵ بجے وکٹوریہ پارک میں ایٹ ہوم ہے اور آج ہی سات بجے منصور منزل میں افطار پارٹی۔ رات کو نو بجے خان بہادر صاحب کے یہاں ڈنر۔ چہرہ پر کچھ عجیب فکر کے آثار جس طرح سرکاری کاموں کی زیادتی سے دفتر کا کوئی کلرک گھبرا جائے۔ پوچھا کہ بھائی متفکر کیوں ہو۔ خیریت تو ہے تو جواب ملا۔ کیا بتاؤں۔ یک انار و صد بیمار والا قصہ ہے۔ ایک ہی دن میں تین تین پارٹیاں ہیں۔ جہاں نہیں جاتا شکایت ہوتی ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو جانا تو پڑے ہی گا۔ ہم نے پوچھا۔ "یعنی تینوں پارٹیوں میں" بےکسی کے ساتھ فرمایا۔ "اور کیا" ہمارا بھی دل بھر آیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر ہم نے بھی کہہ دیا ؎

دعوتیں اس قدر تھیں گر یارب
اس کو معدے کئی دیئے ہوتے

مگر دراصل یہ ان کے لئے کوئی زحمت کی بات نہ تھی بلکہ وہ دعوت کو خدا

کی رحمت سمجھتے تھے اور دعوتوں کی زیادتی بارانِ رحمت کی طرح چاہتے تھے۔ گھر کا کھانا غریب کی قسمت میں تھا ہی کب اور اگر کبھی وہ گھر پہ کھانا مانگ بیٹھتے تھے تو بیوی کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگتی تھیں کہ خدا جانے کیسی طبیعت ہے۔ دراصل اس قسم کے معدے تو اب مل ہی نہیں سکتے کہ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت کی متعدد دعوتیں منظور کرلیں۔ پیٹ کا کچھ حصّہ یہاں بھرا کچھ وہاں اور کچھ تیسری دعوت میں، معدہ نہ ہوا اچھا خاصا مال گودام ہو گیا۔ یہاں تو اگر ایک مرتبہ بھی منہ جھٹال لیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں ملک الموت کی دعوت کا R.S.V.P دینا پڑے۔ یہ تماشہ تو اکثر ہوا کہ اخبار میں ایک ہی روز کی متعدد دعوتوں اور پارٹیوں کا ذکر چھپا ہے اور آپ کا نام نامی اسم گرامی ہر پارٹی کے شرکاء میں موجود، اگر کسی کو حیرت نہ ہو تو حیرت ہے ورنہ عام طور پر تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے ہی نہیں کہ یہ آدمی ہے یا آسیب، ایک ہی وقت میں متعدد جگہ موجود، انسان نہ ہوا ریڈیو پروگرام ہو گیا۔

خیر ان حضرت کی پارٹی بازی کے اس شوق میں تو نیّت کی خرابی سے زیادہ سوشل تعلّقات کی نمائش کو بھی دخل تھا ورنہ دعوتوں اور پارٹیوں کے تو ایسے ایسے شوقین گزرے ہیں جن کو پورے خلوص کے ساتھ محض پارٹی

تعلّق ہوتا تھا نہ شوشل تعلّقات سے کوئی بحث، نہ دعوت میں شرکت کے اخلاقی پہلو پر کوئی نظر، ان کے لئے دعوت دعوت سب برابر، خواہ دعوتِ ولیمہ ہو یا کسی کے چالیسویں کی دعوت، وہ سب یکساں اہتمام کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر معدہ آزمائی کے لئے دعوت میں پہنچے اور واپسی میں ایک ہفتہ تک صاحبِ فراش رہ کر میزبان کا حقِ نمک ادا کرتے رہے۔ ہمارے ایک دوست ہر دعوت کے موقع پر دو وقت کا فاقہ پہلے سے انتظاماً کرتے تھے اور دو دن کا فاقہ بعد میں ڈاکٹر کے مشورہ سے کرنا پڑتا تھا مگر رفتہ رفتہ معدہ عادی ہو گیا اور فاقوں کے بغیر آپ ہر دعوت کے موقع پر المکلف الخدمت کو شکر گذاری کا موقع دے کر ماحضر تناول فرمانے لگے۔

بعض حضرات دعوتوں اور پارٹیوں کے کارڈ حاصل کرنے کے لئے ایسی ایسی کوششیں فرماتے ہیں کہ کیا کوئی بے روزگار کسی ملازمت کے حاصل کرنے کے لئے کوشش کریگا۔ دوڑ دھوپ ہوتی ہے۔ سعی سفارش سے کام لیا جاتا ہے۔ میزبان پر مختلف قسم کے اثر اور دباؤ ڈالے جاتے ہیں اور آخر کار ایک دعوت نامہ حاصل کر ہی لیا جاتا ہے۔ مگر اس کا مقصد کھانا نہیں ہوتا بلکہ یہ کوششیں عام طور پر اُن دعوتوں اور پارٹیوں کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں جن

میں کھانے سے زیادہ کچھ اور باتیں بھی جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ پارٹی کسی بہت بڑے آدمی کے اعزاز میں ہو اور ہر شخص اس کو اپنے لئے باعثِ عزّت سمجھے کہ ان کی پارٹی میں ہم بھی شریک تھے۔ یا کوئی بہت بڑا جلسہ اسی پارٹی کے سلسلہ میں ہونے والا ہو۔ یا حکام پر یہ اثر ڈالنا ہو کہ ہماری پہنچ بھی کہاں کہاں ہے یا اس پارٹی کی شرکت کے بعد ان لوگوں کو مرعوب کرنا ہو جو اس پارٹی میں شریک نہ ہو سکے ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اپنے ایک دوست کی نہایت درد ناک موت دیکھی ہے۔ خدا بخشے مرحوم یہی تمنا لئے دنیا سے اُٹھ گئے کہ گورنمنٹ ہاؤس کی کسی پارٹی کا کارڈ ان کو حاصل ہو جائے ان کے دوستوں اور ہمدردوں نے بڑی بڑی کوششیں کیں مگر قبل اس کے کہ ان کی یہ تمنا پوری ہو عمر نے وفائی کر گئی۔

پارٹی بازوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مبارک قسم وہ ہے جس کو خود پارٹیاں کرنے کا شوق ہوتا ہے اور غالباً یہی وہ نیک اللہ کے بندے ہیں جن کی وجہ سے دنیا اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ کسی مجبوری کے باعث دعوت کرنا تو خیر دوسری بات ہے۔ مثلاً یہ حادثہ کہ صاحبزادے کی شادی جھپٹ پڑی سر پر لہٰذا دعوت کرنا ہی پڑے گی۔ والد صاحب کا انتقال ہو گیا لہٰذا چالیسواں نہ کرینگے تو جائیں گے کہاں۔ کوئی دوست آ رہا ہے اُس کی پارٹی نہ کرینگے تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے

اس قسم کی دعوتیں اور پارٹیاں تو ہر ایک کرگذرتا ہے مگر جن حضرات کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ تو ایسے اشرف المخلوقات ہوتے ہیں کہ دعوتوں اور پارٹیوں کے بہانے ڈھونڈھا کرتے ہیں ہر ہفتہ گورنمنٹ گزٹ دیکھتے ہیں کہ کن حکام کا تبادلہ ہوا تاکہ ان کو رخصتی پارٹی دی جا سکے۔ کن نئے حکام کا تقرر ہوا تاکہ ان کو مدعو کریں۔ کن صاحب کی ترقی ہوئی تاکہ ان کے اعزاز میں دعوت ہو۔ فہرست خطابات میں دعوتوں کے امکان ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ اسمبلی اور کونسل سے لے کر میونسپل بورڈ تک کے انتخابات کے موقعوں پر بھی دعوتوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں۔ شہر میں کوئی قابل ذکر شخص آجائے اور بغیر ان کی دعوت کے نکل جائے کیا مجال۔ شہر میں کوئی مشاعرہ ہے تو بیرونجات کے شعراء آپ کے دسترخوان پر جمع ہیں۔ کوئی دنگل ہے تو آپ کے دسترخوان پر پہلوان زور آزمائی کر رہے ہیں۔ کوئی میوزک کانفرنس ہے تو آپ کے یہاں برتن بج رہے ہیں۔ لیڈروں کا کوئی اجتماع ہے تو آپ کی میز گول میز کانفرنس بنی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ بہانے ہی تلاش کرنا ٹھہرے تو دعوتوں اور پارٹیوں کی کیا کمی مگر اس قسم کے لوگوں کی ایک تو یوں ہی کمی ہے دوسرے جو ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں کچھ دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

اور کچھ ایسے ہیں جو شادی کر چکے ہیں۔ دیوالیہ ہو جانے والی بات تو بالکل صاف ہے لیکن شادی والا شعر شرح چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے ایور ریڈی میزبانوں کو اپنی اس مبارک عادت کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مصیبت گھریلو مخالفت کی پیش آتی ہے۔ بیویاں عام طور پر دعوتوں کی تائید میں نہیں ہوتیں۔ ایک تو شوہر کے احباب یوں ہی ان کے لئے موت کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں کہ بیوی اور میاں کی افتادِ طبیعت ایک ہی ہو یہ اتفاق تو بہت ہی کم ہوتا ہے کہ دونوں کے دونوں متواضع ہوں دونوں کو دعوتیں کرنے اور پارٹیاں دینے کا یکساں شوق ہو نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بیویاں دعوتوں کا خرچ بچانا چاہتی ہیں اور شوہر بیویوں سے اپنی جان بچاتے ہیں۔ اس آپس کی ضد میں مارے جاتے ہیں احباب یعنی دعوتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک عبرت انگیز تجربہ بھی ہو چکا۔ ہمارے ایک نہایت پارٹی باز دوست جن کو دعوتوں کی خوشبو سونگھنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا اور بڑی امنگوں کے ساتھ پارٹیوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے ایک مرتبہ خود پھنس گئے۔ ہوا یہ کہ مچھلی کی کچھ بات ہو رہی تھی آپ کے منہ سے نکل گیا کہ مچھلی پکانا تو میری

بیوی پر ختم ہے۔ ہم لوگوں کی توجہ بھی اس طرف ہوئی کہ واقعی اس شخص سے آخر دعوت کیوں نہ لی جائے۔ چنانچہ ان سے دعوت مانگی گئی اور بیچارے کو دن مقرر کرنا پڑا۔ مگر اب جو مقررہ دن اور وقت پر ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے ہیں تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ بظاہر وہ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے مگر رخِ روشن پر مچھلی کی طرح شامت تڑپ رہی تھی۔ ہم لوگوں کو بٹھا کر جو آپ غائب ہوئے ہیں تو اب آتے ہیں نہ تب، بارہ سے ایک اور ایک سے دو بج گئے۔ بھوک کے علاوہ ہم لوگوں کو یہ بھی فکر کہ آخر ہوا کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مچھلی پکڑنے گئے ہوں اور مچھلی نے خود ان حضرت کو پکڑ لیا ہو۔ دروازہ کے ایک سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو عجیب نقشہ تھا مچھلی چارپائی پر پھولی سوجھی لیٹی تھی اور آپ ڈگن لگائے بیٹھے تھے آخر آپ نے فرمایا۔ "خدا کے لئے اس وقت تو ناک نہ کٹواؤ۔"

بیوی نے کہا۔ "ناک کٹے یا کان۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تم دنیا بھر کے مر بھکوں کو سمیٹ سمیٹ کر لاؤ اور میں بیٹھ کر ان کے لئے چولھے میں اپنا منہ جھلسوں یہ وہی لوگ تو ہیں جن کے ساتھ تاش پتے کھیلے جاتے ہیں۔ موئے آوارہ گرد خانہ بدوش کہیں کے۔" میاں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر پہلے تو ان کو خاموش

رکھنے کی کوشش کی اور اس کے بعد باہر کا رُخ کیا مگر باہر آتے ہی ان کے چہرہ پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ہنس کر فرمایا۔ "بھئی وُہ تمہاری بھابی کہہ رہی ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اتنی تکلیف اُٹھائی ہے تو تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں۔ ابھی مچھلی تیار ہوتی جاتی ہے"۔ ہم لوگ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ کر ہنس دیئے مگر ان حضرت کے پھر گھر میں جاتے ہی بغیر جوتے باندھے جو وہاں سے بھاگے ہیں تو ایک ہوٹل میں آ کر دم لیا اور آئندہ کے لئے خلوصِ دل سے توبہ کی کہ زبردستی کسی سے دعوت کبھی نہ لیں گے حالانکہ ہمارے ان دوست کو اب تک شکایت ہے کہ اُس روز تمام کھانا خراب ہوا اور بیوی الگ ناراض ہوئیں۔ بیوی کا ناراض ہونا تو خیر ہم لوگ خود بھی دیکھ چکے تھے مگر کھانا خراب ہونے والی روایت کے راوی کی اصل سزا یہی ہے کہ وُہ اسی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

لکھنؤ کانگریس سشن

لکھنؤ میں اس مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اور خوب ہوا۔ خاصی چہل پہل تھی۔ خاصی رونق تھی۔ آریہ نگر کے جنگل میں ایسا منگل منایا گیا کہ اس ویرانہ کو موتی نگر بنا کر چمکا دیا گیا۔ نمائش بھی تھی اور مشاعرہ بھی۔ ڈرامہ بھی ہوا اور کوئی سمیلن بھی۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو اس موقع پر ہم کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ ارباب کانگریس اس گلستان اودھ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب اس چمن کی بہاریں لوٹ لی گئیں اور خزاں نے اس کو اجڑا ہوا دیار بنا دیا۔ کاش وہ شاہی زمانہ ہوتا جب یہاں

کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات ہوا کرتی تھی۔ اس عروس البلاد میں اگر اس وقت کانگریس سیشن ہوتا تو معلوم بھی ہوتا کہ ہاں صاحب لکھنؤ میں بھی کانگریس ہوئی تھی۔ مگر اب تو جس طرح احمد آباد یا بمبئی میں اجلاس ہوتے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اس فرضِ سیاسی کو ادا کر دیا گیا۔ مگر اس وقت یعنی جب لکھنؤ لکھنؤ تھا۔ یہاں سیشن ہوتا تو اخبارات وہ رپورٹ پیش نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے بلکہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے عالمِ تصوّر کی سیر کرنا چاہیں تو اپنے کو لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجئے اور ملاحظہ فرمایئے اس شاہی دور کے کانگریس سیشن کی روداد۔

لکھنؤ کے موتی نگر کا صدر دروازہ جامہ دار کا بنا ہوا تھا اور اوپر ایک گنگا جمنی جھنڈا لگا تھا۔ اس جھنڈے کے نیچے ہی روشن چوکی رکھی ہوئی تھی جس کے سُریلے زمزمے فضا میں ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلسِ استقبالیہ کے صدر اور چند اراکین مہمانوں کے استقبال کیلئے موجود تھے اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور دیدہ و دل فرشِ راہ کر کر کے معزّز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سرخی کٹی ہوتی۔ سڑکوں پر کیوڑہ اور

گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے دورویہ ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی حسن افروز بھی بنی ہوئی تھیں اور شامہ نواز بھی - ان ہی سڑکوں پر جا بجا ساقی حقّہ لئے ہوئے اور حقّہ پر ہار لپیٹے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ جن کے خمیرے کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے پنڈال تک گئی تھی۔ اس کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی پان کی دکان تھی تو کوئی پھلکیوں کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں دبی ہوئی پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں۔ تو کہیں دکان پر انواع و اقسام کے کنکوے اور ہر قسم کی ڈور سجی ہوئی تھی۔ کوئی چاءدانی کی دکان تھی، تو کسی دکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے۔ مختصر یہ کہ دو فرلانگ تک یہ خاص سڑک اسی طرح بارونق بنائی گئی تھی۔ کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس سڑک نے حاصل کر لی ہے وہی چہچہے تھے اور وہی غلغلے۔

دو فرلانگ تک اس خوبصورت اور بارونق معطّر اور منوّر سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال ملتا تھا۔ جس کو لکھنؤ

کی نفاست پسندوں کا ایک جامع نمونہ کہنا چاہیئے۔ پنڈال جالی کا بنایا گیا تھا تاکہ ہوادار بھی رہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے اور شرکاء اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لئے پنڈال کے اوپر ایک مخملی شامیانہ لگایا گیا تھا جس میں ہر طرف خس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو باندھ دیا جائے اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آسکے۔ اور اگر دن کا اجلاس ہو تو لُو سے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لئے یہ پردے کھول دیئے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخملی گاؤ تکئے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لئے اس پنڈال کے اندر کارچوبی شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا اور سامنے ہی قدِ آدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب گنگا جمنی کا اگال دان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکاء اجلاس کے لئے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان رکھے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور اُگال دان نہایت سلیقہ اور قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لئے چنگیر رکھے ہوئے تھے

اور ہر کھنگیرے کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں اور قندیلوں سے منوّر کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۸ بجے شب مقرر ہوا تھا مگر ۹ بجے شرکا نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معزز حاضرین سے بھر گیا اور ٹھیک سوا دس بجے پہلے گولا چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا اور آخر میں نقیب نے بھرے پنڈال میں آ کر آواز لگائی ؎

نگہ دار۔ ہوشیار۔ آتے ہیں
صدرِ عالی وقار، آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرینِ بزم کھڑے ہو گئے اور پنڈال کے صدر دروازہ سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے اور درمیان میں صدرِ محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں خراماں تشریف لائے، ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کئے اور خود صدر محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجا لاکر، اور تسلیمات عرض کر کے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدر محترم اپنی جگہ پر

رونق افروز ہوئے اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرین بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دو زانو بیٹھ گئے اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کاروائی شروع ہونے سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ حسّو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرین محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد بنارس اور آگرہ کی دو چرکیاں نبٹیں۔ آخر میں میاں مصطفٰے حسین کا ترانہ طائفہ آیا۔ جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبین کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس نغمہ و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کاروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے بعد اور آخر میں صدر محترم سے ہاتھ جوڑ کر اجازت طلب کر کے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کو پڑھتے ہی تمام پنڈال "ماشاءاللہ اور کیا برمحل صرف ہے اس شعر کا" کے نعروں سے گونج اٹھا اور صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ ملتوی کر کے

ہر طرف گھوم گھوم کر سلام شروع کر دیئے اور "مکرر ارشاد" کے حکم کی تعمیل میں اس شعر کو پھر پڑھا۔ اور شعر کے بعد اپنا خطبہ جو مقفّیٰ اُردو میں تحریر کیا تھا شروع کیا۔ اس خطبہ کے ایک ایک حصّہ پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی تھی اور صدرِ مجلسِ استقبالیہ کا ہاتھ گویا، سلام کرنے کی کمانی دار مشین بنا ہوا تھا۔ یہ خطبہ گو بہت مختصر تھا۔ مگر مکرّر ارشاد کے تقاضوں اور خطیب کے سلام کرنے اور داد وصول کرنے کے وقفوں کی وجہ سے ایک گھنٹہ میں ختم ہوا اور خطبہ کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔

اس کے بعد صدرِ محترم کھڑے ہوتے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی حاضرینِ بزم نے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ مگر صدرِ محترم کے اشارے سے سب پھر بیٹھ گئے۔ اب صدرِ محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی جس کا جواب سب نے ہاتھ جوڑ کر "بسم اللہ" اور "سب ہمہ تن گوش ہیں" کے متفقہ نعروں سے دیا۔ آخر تین چار مرتبہ کھنکھار کر اور ریشمی رومال سے مُنہ صاف کرنے کے بعد صدرِ محترم نے فرمایا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

اور اسے حضور!

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "اے سبحان اللہ" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا ہے کہ خود صدرِ محترم بھی تھوڑے اچھل پڑے اور پھر فوراً سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیئے۔ تین چار مرتبہ حاضرینِ محفل کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا۔ پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیری نہیں ہوئی ایک مرتبہ اور مرحمت فرما دیجئے۔ آخر صدرِ محترم نے پھر یہی شعر پڑھا اور شعر پڑھنے کے بعد اپنا خطبہ شروع کیا :-

"ہر چند کہ یہ خاکسار فرائضِ صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور بتغیر بھی اس ہیچمدان کا بیمار تھا۔ مگر آپ حضرات کا اصرار، اور پھر اس اصرار کی تکرار از مجبوراً مزید انکار سے قاصر ہوا۔ اور افتاں و خیزاں تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوا۔

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام لوچ سلاموں میں صرف کرنے کے بعد پھر فرمایا :-

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھاتا ہوں بلکہ باوا جان مرحوم کی روحِ پاک

کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا اور انکار میرا کسرِ نفسی میں شامل نہ تھا۔ مگر آپ حضرات نے اس کو عذرِ لنگ جانا اور میرا کوئی حیلہ صحیح نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بھول جانا پڑا اور کشاں کشاں جانبِ بزمِ کانگریس آنا پڑا۔

حاضرین نے پھر "حضور واللہ ہے کہ موتی پرو دیئے ہیں اور جواہرات جڑے ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدرِ محترم نے ہاتھوں کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا :-

"آج ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے۔ وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش کے سخت محال ہے"

حاضرین نے ہم آواز ہو کر کہا :-

"کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے"

صدرِ محترم نے پھر مجرا بجا کر ارشاد فرمایا :-

"باہمی اتفاق یعنی سدِباب نفاق و شقاق، ازبس ضروری ہے اور بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں سخت مجبوری ہے۔ ہماری راہ پُرخطر اور دشوار ہے۔ منزل دور ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب تو

ٹلنا ہے اور مٹانا ہے یعنی بہرصورت مقدّر کو آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجیے کہ درخشاں نیرِّ اقبال ہے"۔

"آمین آمین۔ آپ کے منہ میں گھی شکر" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ صدر نے پھر فرمایا:۔

"ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ ذلتوں کی انتہا ہو گئی۔ تکلیف حد سے سوا ہو گئی۔ ہم شاہزادے ہو کر بات بات کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول اور لگان مانگنے والے خدا غارت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم پیٹ کاٹ کر اور بٹیروں کی پالیاں بند کر کے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں گویا ہم اپنی جان سے دور، جان دے دیں اور بٹیریں بھی نصیب اعداء مریں"۔

حاضرین نے "دور پار۔ چھائیں پھوئیں مدعی" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے اور ہم خود شاہزادے ہیں۔ تو ہم مرغ کی پالیوں کا ٹیکس، بٹیر بازی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبۂ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا اور آخر میں جناب صدر نعرہ ہائے تحسین و آفرین کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر، خستہ ہو کر پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے، چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برفِ آب لے کر دوڑا۔ تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ آخر دس پندرہ منٹ کے بعد صدر محترم کے حواس بجا ہوئے اور اس کے بعد اجلاس کی ایجنڈے کے مطابق کاروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربار شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگان وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۳۳ فیصدی حقوق دیئے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگانِ اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب والا سے مرزا صاحب کھڑے ہوئے ہیں اور حاضرینِ محفل کو جھک جھک کر سلام کئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیرا اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد ایک مدلّل مقفّیٰ اور مسجع تقریر میں دربار شاہی میں اپنے ۳۳ فیصدی حقوق پر زور دیا اور آدھ گھنٹہ تک تقریر کرنے کے بعد شاہزادہ والا تبار، برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر کھڑے ہونے والے تھے لہذا

خدمتگار نے فوراً آئینہ پیش کر دیا۔ آپ نے آئینہ میں ٹوپی کو درست کر کے اور مونچھوں کا تاؤ ٹھیک کرنے کے بعد ایک گلوری نوش فرمائی اور اس کے بعد کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے "یا علیؑ" اور بسم اللہ کا نعرہ بلند ہوا جس کے جواب میں آپ نے حاضرین کو سلام کرنے کے بعد فرمایا :-

"اے حضرات میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اختلاج قلب کا پرانا بیمار ہوں۔ آپ کو معلوم ہے بھائی دلارے مرزا عرف لاڈلے نواب میرے دوست ہیں لیکن سچ پوچھئے تو میرے گوشت اور پوست ہیں مگر آج انہوں نے غیروں سے بڑھ کر مغائرت سے بھری ہوئی تقریر کی ہے یعنی اپنے اور میرے دوستانہ مراسم کی تحقیر کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر حقوق میں فیصدی کا کیا سوال ہے۔ دوستی میں تو سب کا یکساں حال ہے۔ وہ سر آنکھوں پر دربار میں تشریف لائیں۔ اور اگر کوئی کرسی خالی نہ ہو تو ہمارے دل میں جگہ پائیں۔ مگر خدا کے لئے یہ غیریت نہ فرمایئے اور بسر و چشم دربار میں تشریف لایئے۔ نواب فلک رفعت سلام کر کے بیٹھ گئے اور اس کے بعد نواب دلارے مرزا پھر کھڑے ہونے والے تھے مگر تسبیح دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹک گئے اور آخر کھڑے ہو کر صرف اتنا کہا کہ میں کچھ عرض کرتا ہوں مگر استخارہ منع آرہا ہے۔ گویا

بھائی صاحب نواب فلک رفعت کی من جانب اللہ تائید ہو رہی ہے لہذا یہاں بھی سر تسلیم خم ہے۔

ایجنڈے میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ اُمید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا۔ مگر ہوا یہ کہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہو گئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔ نوابزادگان نے شاہزادوں کی کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

"حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں"۔

"شاہزادوں نے کہا" نہیں پہلے آپ"۔

نوابزادوں نے کہا" پہلے آپ"۔

شاہزادوں نے کہا۔" واللہ یہ نہ ہوگا۔ پہلے آپ' آخر اسی پہلے آپ' اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہو گئی اور اجلاس ختم ہو گیا۔

اس طلسم خیال کو توڑیئے اور بتائیے کہ ایسی حسین کانگریس کے مقابلہ میں جس کا نازک بدن تصور جوف دماغ میں محدود تخیّل رہ گیا ہے۔ ہم کو باوجود تمام زیبائشوں اور دلفریبیوں کے یہ کھدّر قسم کی کانگریس کیونکر پسند آسکتی تھی یا کسی ایسے شخص کو اس قسم کا کانگریس سیشن کیونکر پسند آسکتا ہے جس کا دماغ عہد پارینہ کے تصور سے معطّر ہو رہا ہو۔

خدا سر دے تو سودا دے

عاشق بننے کے لئے نہ بی اے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے نہ ایم اے ہونے کی، نہ صاحب جائداد کی قید ہے نہ شریف خاندان کی، جس کو اللہ توفیق دے عاشق بن سکتا ہے اور جس طرح شیلے، شکسپیئر، غالب، مومن حافظ وغیرہ کا نام ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اسی طرح مجنوں اور فرہاد اور ان کی طرح دوسرے عاشقوں کا نام دس مرتبہ ایک غزل میں آنے کا قانوناً مستحق ہو جاتا ہے۔ آخر مجنوں بھی آدمی تھا فرہاد بھی ہماری طرح انسان تھا اور دونوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ آج

تک ہر شاعر جب تک ان کا نام لے کر غزل شروع نہ کرے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ نہ پڑھے لکھے تھے نہ ایسے مالدار تھے۔ نہ ان کے حسن میں کوئی خاص بات تھی بلکہ اگر سچ پوچھئے تو ان سے زیادہ پڑھے لکھے مالدار، خوبصورت نہ سہی مگر خیر پھر بھی انسان کی صورت کے ہم خود ہیں جب اُن لوگوں نے عشق کر کے ایسا نام حاصل کر لیا تو کیا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سے اب دُنیا کا کوئی کام نہ ہو گا——"

بُدھن کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا۔ اور وہ اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ سڑک پر لیٹا ہوا کتا بھی دکھائی نہ دیا۔ کتے پر پیر پڑا اور اس کی "بھوں بھوں" نے تمام محویت کے نشہ کو ہرن کر دیا اُچھل کر ایک دکان پر چڑھ گئے، خیریت ہوئی کہ کتے نے کاٹا واٹا نہیں لیکن اگر یہ حادثہ پیش نہ آجاتا تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے بُدھن نہ معلوم کب کے عاشق بن چکے ہوتے۔ کتے پر پیر پڑ جانے سے خیالات پریشان ہو گئے۔ لیکن اس عاشق بن جانے کی اسکیم پر اطمینان سے غور کرنے کا ارادہ کر کے گھر پہنچے اور اچکن وغیرہ اُتار کر اسی فکر میں چارپائی پر لیٹ گئے۔ بُدھن اس مسئلہ پر جتنا جتنا غور کرتے تھے اُن کی اُمیدیں

بڑھتی جاتی تھیں اور ہر پہلو سے عاشق بن جانا اچھا ہی نظر آتا تھا مگر پھر انہوں نے سوچا کہ لاؤ ذرا بیوی سے بھی مشورہ کریں۔ ایک سے دو کی رائے مناسب ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بہتر بات بتادیں۔ بہرحال یہ ایک لاجواب ترکیب ہے اور بالکل الہامی طریقے سے ذہن میں آئی ہے بات یہ ہے کہ جب انسان کے دن پھرنے والے ہوتے ہیں تو خود بخود اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کیا خدا کی قدرت ہے۔ دیکھیں بیگم کیا کہتی ہیں؟

"سنتی ہو؟ —— ارے سنا؟ —— ذرا سنو تو سہی بیگم صاحبہ" طلبی پر ہانڈی چولہا چھوڑ کر فوراً حاضر ہو گئیں اور بڈھن کے چہرے پر خلافِ معمول تازگی اور چمک دیکھ کر خود بھی سوالیہ نشان بن گئیں کہ یہ کیا بات کہتے ہیں۔

بڈھن نے نہایت اُمید افزا چہرہ بنا کر کہنا شروع کیا:-

"ذرا قریب بیٹھو۔ آج ایک ترکیب سوجھی ہے وہ لاجواب کہ واللہ تم بھی کیا کہو گی تم کہا کرتی ہو کہ تم سے کچھ نہ ہوگا۔ یونہی بیکار بیٹھے رہو گے اور یہ اور وہ مگر آج دیکھو میں نے کیا ترکیب نکالی ہے۔"

بیگم:۔ "کہو گے بھی یا بس تعریفیں ہی ہوا کرینگی میرا گوشت جلا جاتا ہے۔ ابھی روٹی پکانے کو پڑی ہے"۔

بڈھن:۔ "اجی لعنت بھیجو گوشت کو اور چولھے میں ڈالو روٹی کو تم اطمینان سے سنو جو کچھ مَیں کہتا ہوں مَیں نے وُہ ترکیب سوچی ہے کہ جب تک دُنیا ہے میرا نام باقی رہے گا اور بڑے بڑے لوگ میرے نام کا وظیفہ پڑھیں گے"۔

بیگم:۔ "توبہ ہے کسی طرح بات ختم ہی نہیں ہو سکتی"۔

بڈھن:۔ "سنو تو سہی تم تو بات کاٹ دیتی ہو بھلا تم نے مجنوں کا نام کبھی سُنا ہے"۔

بیگم:۔ "ہاں سُنا ہے پھر؟"

بڈھن:۔ "اگر اسی طرح میں بھی عشق کر لوں تو کہو کیسی رہے ہزاروں لاکھوں برس تک لوگ مجھ کو نہ بھولیں گے۔ وُہ شہرت ہوگی کہ تم بھی یاد کروگی"۔

بیگم:۔ "اے تمہیں خدا سمجھے ایسی عقل پر پتھر پڑیں جو بات کی موئی اوندھی جان بوجھ کر اپنے کو سڑی بنا رکھا ہے۔ میری قسمت میں تمہارا ایسا خبطی لکھا تھا خدا اس سے تو مجھے موت دے دیتا۔ خدا میرے ماں باپ کی روح خوش کرے جنہوں نے میرا پلا ایسے سودائی سے باندھا ہے"۔

بڈھن:۔ ہائیں ہائیں۔ کچھ عقل ماری گئی ہے۔ کچھ پاگل ہو گئی ہو یعنی

میں نے تو ایک اچھی بات کہی اس کی داد یہ ملی کہ سڑی سودائی اور نہ معلوم کیا کیا بنا ڈالا واللہ تم سے کبھی بات کہہ کے طبیعت خوش نہیں ہوتی عجیب بیوقوف قسم کی عورت ہو جاؤ تم اپنا گوشت پکاؤ تم سے ایسی باتوں میں مشورہ لینا ہی میری حماقت تھی۔ لاحول ولاقوۃ"۔

(۲)

حالانکہ بیوی سے سخت مخالفت ہو چکی تھی مگر بدھن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ عاشق بن جانا ہی اس کا ایک علاج باقی رہ گیا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہوا تو پھر ڈوب مرنا چاہیئے۔ خدا کی شان مجنوں اور فرہاد ایسے جاہل کندۂ ناتراش عاشق بن جائیں اور بدھن کچھ نہ بنے مگر جب تک یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی اسی وقت تک کی دیر تھی اب تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ عشق کروں گا اور عاشق بن کر رہونگا۔ مگر سوال یہ تھا کہ عشق کرنے میں کم از کم ایک معشوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے لایا جائے لیکن اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب وہ عشق کرنے پر تیار ہو گیا تو خدا مسبب الاسباب ہے معشوق مل ہی جائیگا۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ لاؤ بیوی سے عشق کر لیں مگر پھر خود ہی اس خیال پر ہنسی بھی آئی کہ اپنی بیوی سے خود

ہی عشق کرنا کس قدر مہمل بات ہے جیسے اپنا شعر پڑھ کر خود ہی سبحان اللہ
کہہ دینا اور پھر خود ہی سلام کر لینا یا اپنی دعوت خود ہی کرنا اور خود ہی مدعو
ہو جانا، عشق بیوی سے نہیں کیا جاتا بیوی سے تو نکاح ہوتا ہے اور عشق
ہوتا ہے معشوق سے۔ لہذا یہ عشق کا قصّہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کر
دیا گیا جب تک کوئی مناسب سا معشوق نہ ملے اور معشوق کی جستجو
شروع کر دی۔ جستجو جس چیز کی بھی کی جائے اس کا نہ ملنا کیسا؟ ہاں ڈھونڈنے
والا چاہیئے۔ بڈھن نے معشوق کی جستجو میں سارا شہر چھان مارا، کوئی گلی
کوئی کوچہ نہ چھوڑا۔ آخر کار معشوق مل کر رہا لیکن ذرا گھر سے دور، خیر اس
سے کیا ہوتا ہے۔ عشق کے نزدیک فاصلہ واصلہ کوئی چیز نہیں۔ مجنوں تو
نجد کے معلوم نہیں دن بھر میں کتنے چکّر لگاتا تھا اور ذرا بھی نہیں تھکتا تھا
چہ جائیکہ اتنا سا فاصلہ کر چار پیسے دیئے اور کھٹ سے یکّے پر بیٹھ کر کوچہ جاناں
میں جا پہنچے۔ تھوڑی دیر عشق کیا اور پھر واپس آگئے۔ دو تین روز تک
بڈھن اسی طرح آتے جاتے رہے لیکن ابھی ان کو عشق کرنا نہیں آتا تھا۔
آخر ایک دن غور کیا کہ عشق کس طرح کریں معشوق بھی خدا کے فضل سے
مل گیا ہے اور عاشق بھی ہم ہیں لیکن عشق کرنے کا طریقہ تو معلوم ہونا چاہیئے

یہ سوچ کر قصہ لیلیٰ مجنوں شروع سے آخر تک رات بھر میں پڑھ ڈالا اور نہایت غور سے پڑھا۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اپنے ٹھیکے میں آئے اور عاشق کی صورت بنانا شروع کی۔ اچکن اُتاری، قمیص کو اُتار کر پھینک دیا۔ صرف گریبان گلے میں ڈال لیا۔ پاجامے کو لنگوٹی کی شکل میں پھاڑ کر باندھ لیا اور ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکل کر بیکے کی تلاش میں چلے۔ لیکن کوئی یکہ والا بٹھانے پر راضی نہ ہوا ایک آدھ سے لڑائی بھی ہوگئی۔ یہ لاکھ کہتے رہے کہ "ابے جانتا نہیں ہے کہ ہم عاشق ہیں" لیکن کسی نے ایک نہ سُنی، کوئی ہنستا کوئی مذاق اُڑا تا رہا۔ بہر حال سب نے متفقہ طور پر پاگل سمجھ کر ان کو یکہ پر نہ بٹھایا اور مجبوراً بیچارے کو پیدل جانا پڑا۔ راستہ میں کتے بھونکے، لڑکوں نے ڈھیلے مارے۔ لوگوں نے مذاق کیا۔ لیکن یہ اپنی دُھن میں سیدھے کوچۂ یار میں آکر ٹھیرے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کچھ کچھ عشق رنگ لایا ہے۔ اس لئے کہ مجنوں پر بھی شروع شروع میں کتے بھونکے تھے اور یہی تمام واقعات گذرے تھے۔ جب عشق کے رنگ لانے کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو معشوق کی کھڑکی کے نیچے پہنچے اور اظہارِ عشق کا عزم بالجزم کر لیا ایک کوئلہ سے کاغذ پر لکھا۔ ع۔ "مرتا ہوں ترے عشق میں اے یار خبر لے" لکھا اور کاغذ کو ایک

پتھر میں باندھ کر سیٹھ جی کی لڑکی پر پھینک دیا۔ کاغذ تو ہوا سے اُڑ گیا لیکن پتھر پیغامِ عشق لے کر سیدھا پیشانیٔ معشوق پر جا کر اس طرح لگا کہ خون بہنا شروع ہو گیا اور "ہائے مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" کی آواز سے سارا محلّہ جمع ہو گیا۔ بدھن معشوق کی ان اداؤں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ معشوق کی انگلی کے ایک اشارے سے چار پانچ آدمیوں نے عاشق کو گرفتار کر لیا۔

(۳)

پولیس کی چوکی بھی عجیب و غریب جگہ ہوتی ہے اور پھر ایک عاشق کے لئے وہاں کسی بات میں شعریت ہی نہیں بس "ابے تبے" کر کے معاملات کی باتیں پوچھ لیں اور حوالات میں بھیج دیا۔ نہ کسی کے احساسات کا خیال نہ لطیف جذبات کا پاس بس ان کو تو اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ بدھن کو بھی وہاں جا کر قلبی اذیت ہوئی جس کو دیکھئے "ابے تو کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا نام ہے؟ تو نے کیا کیا؟ بولتا ہے کہ نہیں؟" یہی کہہ رہا ہے۔ اب کوئی ان سے کیا کہے کہ جس سے تم اس طرح مخاطب ہو وہ کس مرتبہ کا انسان ہے ایک آدھ مرتبہ بدھن نے کہا بھی کہ "بھائی ہم عاشق ہیں عاشق" مگر اس پر کسی نے کان بھی نہ دھرے بس یہی پوچھا کئے "عاشق علی، یا عاشق حسین؟"

اب ان کو کون سمجھاتا کہ عاشق کے لیئے صرف عاشق کہہ دینا ہی کافی ہے۔ جب ان کا اس طرح اطمینان نہ ہوا تو کہا کہ "بھائی ہم عاشق ہیں۔ ہمارا نام بُدھن ہے"۔ کسی نے سُن کر کہا۔ "سڑی ہے" کوئی بولا "بنتا ہے"۔ کسی نے رائے قائم کی کہ "بدمعاش ہے" کسی کا خیال ہوا کہ "خفیہ پولیس ہے"۔ ایک لال بجھکڑ نے بہت غور کے بعد کہا کہ "انقلاب پسند جماعت کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بم باز ہے" آخر ایک صاحب نے گھر کا پتہ پوچھا، تو بتا دیا گیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہم ابھی چلیں گے ہم کو چل کر اپنا مکان بتاؤ"۔ بُدھن نے کہا "بسم اللہ چلیئے آپ کا گھر ہے"۔

پولیس کے سپاہیوں میں گھرے ہوئے بیچارے بُدھن اپنے گھر پہنچے مگر گھر میں نہ جانے پائے، بیوی کو خبر ہوئی تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ محلّہ والوں نے شناخت کی اور سب نے متفقہ طور پر یہی رائے دی کہ "بیچارہ اچھا خاصہ تھا آج ہی دماغ خراب ہو گیا"۔ بیوی نے کہا "نہیں دماغ میں کل شام سے کچھ خلل ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں مجنوں کی طرح عشق کر کے نام کر لوں۔ کیا لاٹ ہے ——— ؟"

بیوی کی آواز سُن کر بُدھن کو پھر غصّہ آیا اور کہنے لگے :۔

"پاگل ہو تم تمہارا کیا ؟ یہ دماغ کی خرابی کی بات ہے یا نام پیدا کرنیکی

ترکیب ہے، تم نے کل بھی جہالت کی باتیں کی تھیں اور آج بھی وہی حماقت، تم سے کون پوچھ رہا ہے تم جاؤ کھانا پکاؤ۔ کسی کا کیا جا رہا ہے۔ ہم نے عشق کیا۔ اچھا کیا، خوب کیا اور کرینگے، ہزار مرتبہ کرینگے دیکھیں تو ہمارا کیا کرتی ہو؟"

بیوی :۔ "اے اپنی گت تو دیکھو۔ ہائے میں لٹ گئی"۔

بڈھن :۔ "گت کیا دیکھیں عاشقوں کی یہی شان ہوتی ہے تم تو ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہو ذرا قصہ لیلیٰ مجنوں اٹھا کر دیکھو کہ مجنوں جس کا آج ڈنکا بج رہا ہے کس شان سے رہتا تھا"۔

بیوی :۔ "ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میں کہیں کی نہ رہی"۔

بڈھن :۔ "اس میں لٹنے کی کونسی بات تھی ایک قمیص میں نے اپنے شوق کیلئے پھاڑی تو یہ لٹ گئیں تم کو میرا عشق ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جانے دو۔ میں نہیں کرونگا عشق، لاؤ کرتہ پاجامہ بکس میں سے نکال دو، مگر اب مجھ کو بیکاری کا طعنہ نہ دینا۔

بیکاری

بیکاری یعنی بے روزگاری اس اعتبار سے تو نہایت لاجواب چیز ہے کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی حیثیت کا انسان اپنے گھر میں تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر اس طرح رہتا ہے کہ ایک شہنشاہ ہفت اقلیم کو اپنے محل میں وہ فارغ البالی نصیب نہیں ہو سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دولت جس کو تمام دنیا کے سرمایہ دار اپنی جان اور اپنا ایمان سمجھتے ہیں، یہ ایک ایسا مستقل عذاب ہے جو انسان کو کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ سرمایہ داروں کی تمام زندگی بس دو ہی فکروں میں کٹتی ہے، ایک یہ کہ کس طرح تمام دنیا کا روپیہ ہمارے خزانے میں آ جائے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہمارا روپیہ چھوڑ لے گئے تو کیا ہوگا ؟ یہ دونوں فکریں اپنی اپنی جگہ ایسی مہلک ہوتی ہیں کہ ان کو بھی دق کی منجملہ دیگر اقسام کے سمجھنا چاہیے بلکہ دق کی دوسری قسمیں تو معمولی ہیں مثلاً پھیپھڑے کی دق، آنتوں کی دق، ہڈی کی دق، وغیرہ مگر یہ فکریں دل اور دماغ کی دق سے کم نہیں جن کا مارا ہوا نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے بس توند بڑھتی جاتی ہے اور دل چھوٹا ہوتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان سرمایہ داروں کی زندگی حقیقتاً جبر و اختیار میں بسر ہوتی ہے کہ نہ زندہ رہتے بن پڑتی ہے نہ مرنے کو دل چاہتا ہے اب رہے غریب ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ بلا ضرورت پیدا ہو گئے۔ اور جب جی چاہا مر گئے۔ نہ جینے کی خوشی تھی نہ مرنے کا کوئی غم۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے (ذوق)

مطلب کہنے کا یہ کہ چاہے ہم کو بے روزگاروں کی جماعت گالیاں دے یا سرمایہ داروں کا طبقہ انعام، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ دنیا کے لئے بیکاری ایک رحمت ہے۔ حالانکہ اس رحمت سے ہندوستان کے علاوہ تمام دنیا کے ممالک چیخ اٹھے ہیں اور ہر طرف سے ہائے پیٹ ہائے پیٹ" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں کہ "ہائے پیٹ"

کی صدائیں "پیٹ پھٹا" کی صداؤں کے مقابلہ میں پھر بھی قابلِ برداشت ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ عجیب اُلٹی سمجھ کا آدمی ہے کہ تر لقمے پر فاقے کو ترجیح دیتا ہے لیکن جناب ہم اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ فاقہ اُسی وقت تک فاقہ ہے جب تک تر لقمے کی اُمید انسان کے پیٹ کو جہنم اور معدے کو ربڑ کا بنائے ہوئے ہے لیکن اگر انسان تر لقمے سے خالی الذہن ہو جائے تو یہی فاقہ اُس کے لئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب مرحوم نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی قسم کی ایک بات کہی ہے جس کا ترجمہ ہمارے الفاظ میں یہ ہوا کہ ؎

فاقہ کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتی ہے بھوک
اس قدر فاقے پڑے ہم پر کہ لقمہ بن گئے

ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ معمولی سمجھ کے انسانوں کے لئے بیکار ہے لہٰذا اس کا کہنا بھی فضول سی بات ہے اور نہ اس وقت ہم اس قسم کی بلند باتیں کرنا چاہتے ہیں ہم تو اس وقت بیکاری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جس کے خلاف تمام دُنیا میں احتجاج کا ایک شور مچا ہوا ہے بیکاری اچھی چیز ہے یا بُری اس کے متعلق ہم اپنے ذاتی خیال کو اگر تفصیل کے ساتھ پیش کریں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ یا تو ہماری جان خطرے

میں پڑ جائیگی ورنہ یہ تمام دُنیا کی تجارت، کاروبار اور ملازمتیں وغیرہ سب مفلوج ہو کر رہ جائینگی۔ لہٰذا دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ذرا ڈر معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں اُونٹ کس کروٹ بیٹھے اس لئے بہترین صورت یہی ہے کہ عام نقطۂ نظر سے ہم بھی بیکاری کو بُرا فرض کرنے کے بعد اپنے "خامہ" سے چلُ "بسم اللہ" کہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ نئی اور پُرانی دُنیا ملاکر جو کرۂ ارض بنتا ہے اس میں تین چوتھائی تو "بحرالکاہل"، "بحرالغافل"، "بحرالجاہل" وغیرہ کی قسم کے بڑے بڑے سمندر ہیں یعنی پانی ہی پانی۔ اب رہ گئی، ایک چوتھائی دُنیا جو خدا نظر بد سے بچائے خشکی ہے۔ اس ایک چوتھائی دُنیا میں لق و دق صحرا، سر بفلک پہاڑ، ریگستان جن کو انسان سے کوئی تعلق نہیں، بس "شترستان" کہنا چاہیئے۔ اور جھیلیں، دریا، نالے وغیرہ ہیں۔ باقی جو بچی تھوڑی سی خشکی اس میں کھیت اور باغ وغیرہ سے بچی ہوئی خشکی کو گاؤں، تحصیل، پرگنہ، شہر، ضلع، صوبہ، ملک اور براعظم وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور یہ ہے وُہ مختصر سی گنجائش جس میں جناب اشرف المخلوقات مع چرندوں پرندوں، درندوں کے رہتے ہیں۔ اس محدود گنجائش میں آبادی کا یہ حال ہے

کہ خدا کی پناہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دُنیا کی وسعتیں محدود ہیں اور نسلِ انسانی کی ترقی غیر محدود۔ اب جو لوگ بیکاری کا رونا روتے ہیں تو آپ ہی بتایئے کہ یہ دنیا کا قصور ہے یا دُنیا کے بسنے والوں کا۔ ہاں اگر نظامِ فطرت یہ ہوتا کہ ہر ایک انسان کے ساتھ ساتھ ایک آدھ بگیھہ زمین بھی پیدا ہُوا کرتی تو واقعی بیکاری کے متعلق ہماری تمام شکایتیں حق بجانب تھیں مگر اب تو ہر نیا پیدا ہونے والا اس چھوٹی سی دُنیا میں گنجائش حاصل کر لینا چاہتا ہے جو بابا آدم کے وقت سے لے کر اب تک یعنی از آدم تا ایں دم ایک انچ بھی نہیں بڑھی۔ آپ کہیں گے واہ بڑھی کیوں نہیں۔ یہ جو کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگا کر اس دُنیا میں ایک اور اضافہ کیا وہ کدھر گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وُہ پہلے سے موجود تھا۔ جب تک انسان کی جستجو میں کامیاب ہونے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی وُہ پوشیدہ رہا اور جب اس کو ڈھونڈھا گیا تو وُہ مل گیا لیکن اب یہ اُمید رکھنا کہ کوئی اور امریکہ مل جائے گا۔ غلط ہے۔ اس لئے کہ اب انسان کو بیکاری کے غم نے یا تو اس قدر پست ہمت کر دیا ہے کہ وُہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالنے میں بھی کاہلی سے کام لیتا ہے۔ یا سرمایہ داری نے ایسا دماغ خراب کر دیا ہے کہ مریخ پر سلطنت کرنے کی فکر ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ ہوا میں قلعہ

بنانے کی جدوجہد کامیاب ہو جائے۔ لیکن ابھی تو ہم دنیا سے جا کر مریخ میں آباد ہونے کیلئے تیار نہیں۔

لاحول و لا قوۃ کہاں سے کہاں پہنچے۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ افسانوں کی کثرت نے دنیا میں بیکاری کی وبا پھیلا دی ہے۔ بات یہ ہے کہ بڈھے تو مرنے کا نام نہیں لیتے اور بچے پیدا ہونا بند نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ جہاں پانچ بچے پہلے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہاں اب پانچ ہزار تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پہلے تو یہ تھا کہ یہ پانچ بچے پڑھنے کے بعد پانچ جگہوں پر ملازم ہو جاتے تھے۔ ملازمت کرتے تھے۔ پنشن لیتے تھے اور مر جاتے تھے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ملازمتیں تو وہی پانچ ہیں لیکن ان کے اُمیدوار بجائے پانچ کے پانچ ہزار ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پانچ تو بدستور سابق برسرِ پیکار ہو جائیں گے۔ اب رہے چار ہزار نو سو پچانوے وُہ یقینی طور پر بیکار رہیں گے۔ یہ غلطی دراصل حساب کی غلطی ہے کہ اب آمد و خرچ برابر نہیں رہا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اِدھر پانچ بچے پیدا ہوتے تو اُدھر پانچ بڈھے مر گئے۔ اِدھر پانچ اُمیدوار ملازم ہوئے تو اُدھر پانچ ملازموں نے پنشن لے لی۔ لیکن اب بڈھوں نے مرنا ترک کر دیا ہے اور

بچّے برابر پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس صورت میں کوئی بڑے سے بڑا ریاضی داں ہم کو بتائے کہ حساب فہمی کا آخر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اب یہ دیکھیے کہ پانچ ہزار میں سے پانچ کے برسرِ روزگار ہو جانے کے بعد جو باقی بچے تھے چار ہزار نو سو پچانوے، وُہ گویا سب کے سب بیکار ہوئے ان بیچاروں کا یہ حال ہے کہ خدا دشمن کا بھی نہ کرے۔ ہائے وُہ طالب علمی کی اُمیدیں کہ بس پاس ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری اپنے گھر کی لونڈی ہے۔ فارغ التحصیل ہُوئے اور آنریبل بنے اگر گورنر نہیں تو ان کے باجلاس کونسل تو ضرور ہی ہو جائیں گے لیکن جب پڑھنے کے بعد درخواستیں بھیجنا شروع کیں تو ہر جگہ سے نامنظور ہو کر واپسی ڈاک گھر پر آ گئیں۔ اب بتلایئے کہ اس وقت وُہ بیچارے کیا کریں۔ کوئی تو گھبرا کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے کوئی تجارت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کوئی ڈپٹی کلکٹری سے نااُمید ہو کر ریلوے میں ٹکٹ کلکٹری کر لیتا ہے۔ کوئی بجائے آنریبل ہونے کے کلارکل لائن میں نکل جاتا ہے اور زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو بس ارادہ کرتے اور بدلتے ہیں۔ تجاویز پر غور کرتے اور رہ جاتے ہیں۔ اسکیمیں بناتے ہیں اور رد کرتے ہیں یعنی بس گھر پر بیٹھے ہوئے بچّوں کو کھلاتے ہیں اور مزے کرتے ہیں

ان لوگوں کو عام طور پر بیکار بے روزگار کہا جاتا ہے اور آج کل دنیا ان ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

نصیحت کرنے والے جو اتفاق سے بے روزگاری کے آلام و مصائب سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں میں آرام طلبی ایسی آگئی ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بس وُہ تو یہ چاہتے ہیں کہ گھر پر پڑے ہوئے چارپائی کے بان توڑا کریں اور روپے کی بارش ہوا کرے۔ ان ناصح بزرگوں سے اب کون کہے کہ جناب والا یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ آپ کا سایہ ہم کمبختوں کے سر پر ہنوز قائم ہے۔ حالانکہ آج کل عمر طبعی بس پچاس پچپن سال ہے۔ یعنی پچپن سالہ کی پنشن پاتے ہی انسان کو مر جانا چاہئے۔ لیکن یہ زبردستی تو ملاحظہ فرمایئے کہ یہ دُہری دُہری عمر طبعی پانے والے بزرگ مرنا تو بھول جاتے ہیں۔ بس یاد یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی نازل کی ہوئی مصیبتوں پر بیکار نوجوانوں کو دن رات لعنت ملامت کیا کریں۔ حالانکہ قصور سب ان ہی کا ہے۔ یہی نوجوان جب بچے تھے تو ان ہی قبرستان کا راستہ بھول جانے والے بزرگوں نے ان بیچاروں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اور تمام زندگی زبردستی پڑھاتے رہے

یہاں تک کہ پڑھانے والے تو قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے، اور پڑھنے والے ایک آدھ درجن بچوں کے باپ بن گئے۔ اب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں اور باپ دادا سب کا پیٹ پالو۔ تو بیچارے کہاں سے پالیں آرام طلب بنا دینے والے آرام طلبی کا طعنہ دیتے ہوئے کس قدر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ بیکار کر دینے والے بیکاری پر لعنت ملامت کرتے ہوئے کیسے بھلے لگتے ہیں۔ ان ناصحوں سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ کو اپنی اولاد کے باکار ہونے کی فکر تھی تو آپ نے اس کو درزی کیوں نہ بنایا، بڑھئی کیوں نہ بنایا، لوہار کیوں نہ ہونے دیا، جوتا بنانا کیوں نہ سکھایا۔ اور تعلیم شروع کرانے سے قبل گلا گھونٹ کر کیوں نہ مار ڈالا۔ پہلے تو تمام زندگی بیکار ضائع کی، اسکول اور کالج کی "لاٹ صاحبانہ" زندگی بسر کرائی۔ سوٹ، بوٹ، لونڈر کا عادی بنایا اور اس مغالطے میں مبتلا رکھا کہ آنے والا دور موجودہ دور سے زیادہ زرّیں اور خوشگوار ہے تو اب یہ شکوہ سنجیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور تمام دنیا کا تو خبر جو کچھ بھی حال ہو لیکن ہندوستان جنّت نشان کا یہ حال ہے کہ یہاں بیکاری کے سبب اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ گویا ہندوستانی انسان کا مقصد حیات یہی بیکاری ہے جس میں سب

مُبتلا ہیں۔ ہندوستان ایسے جاہل مُلک کے پڑھے لکھے بھی دو کوڑی کے اور جاہل بھی دو کوڑی کے بلکہ جو بیچارے پیدائشی یعنی خاندانی جاہل ہیں اُن کی حالت پڑھے لکھوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اسلئے کہ وُہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال لیتے ہیں اور پڑھے لکھوں کا پیٹ اُن کے متعلقین بھرتے ہیں۔ اس وقت بیکاری کا یہ حال ہے کہ ہندوستان کے کسی شہر میں دیکھ لیجئے بہت سے محلّے کے محلّے ایسے نکلیں گے جہاں آپ کی دُعا سے سب خود مختار یعنی آزاد ہونگے، کوئی کسی کا نوکر چاکر نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وُہ کھاتے کہاں سے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ آپ بھی دُنیا کے تمام کام چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہیئے اور دیکھئے کہ خدا کھانے کو دیتا ہے یا نہیں؟ پہلے آپ جائداد پر ہاتھ صاف کرینگے پھر بیوی کے زیور کی باری آئے گی۔ پھر کپڑوں اور برتنوں پر نوبت پہنچے گی۔ مختصر یہ کہ خدا باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اور جمع کی ہوئی گھرہستی کو رکھے، بیوی کے لائے ہوئے زیور کو رکھے اور ان سب کو کوڑیوں کے مول خریدنے والے مہاجنوں کو رکھے، بہر حال آپ انشاء اللہ اچھے سے اچھا کھائینگے اور جس قدر اچھی زندگی آپ کی گزرے گی

وہ توان نوکر چاکر قسم کے برسرکار لوگوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔

مطلب کہنے کا یہ کہ جس بیکاری سے ایک دُنیا چیخ اٹھی ہے۔ اس سے ہندوستان کیوں گھبراتا ہے۔ ہندوستان تو بقول ہمارے خداوندانِ نعمت کے ایک جاہل، وحشی، غیر مہذب اور کالے آدمیوں کا ملک ہے۔ یہاں اگر بیکاری ہے تو کیا تعجب جب یورپ ایسے متمدن، تعلیم یافتہ، مہذب اور گورے آدمیوں کے ملک میں یہ حال ہے کہ بیچارے صاحب لوگ ہر طرح ناکام ثابت ہو کر رہ گئے ہیں کہ ہر شعبۂ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور اُن کی جگہ میم صاحبات براج رہی ہیں اگر خدا نخواستہ ہندوستان میں بھی یہی صورت ہو جاتی کہ "اندرون خانہ" ایک دم سے "بیرون خانہ" اور "بیرون خانہ" ایک دم سے "اندرون خانہ" ہو کر رہ جاتے تو شاید یہاں کے لوگ ہندوستان کو حوا کی بیٹیوں کے لئے چھوڑ کر یا تو کسی ایسی دُنیا میں چلے جاتے جہاں ابن آدم کی حکومت ہو یا خودکشی کر لیتے۔ اس لئے کہ یہ انقلاب ہندوستان کے مردوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہے کہ ان کی بیویاں تو کچہری عدالت کریں اور وہ خود گھرداری کریں۔ بچوں کو کھلائیں یعنی مرد پیدا ہو کر عورت کے فرائض انجام دیں۔ تو جناب مطلب کہنے کا یہ کہ یورپ کی بیکاری

پھر بھی قابلِ برداشت ہے کہ وہاں کے مرد بیکار ہوگئے اور عورتیں باکار ہوگئی ہیں
ایک در بند ہوا تو دوسرا کھل بھی گیا۔ اور ہمارے ہندوستان شریف کے
تو دونوں در اس طرح بند ہوئے ہیں کہ گویا کنجی ہی کھوگئی۔ لہذا اب کبھی
کھلنے کی بھی اُمید نہیں ایسی صورت میں اگر ہندوستان کے لوگ یہ سمجھتے ہیں
کہ بیکاری ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ تو بتائیے کیا غلط سمجھتے ہیں ؟ کیا آپ کا
مطلب یہ ہے کہ بیکار جدوجہد کر کے اپنی جان دے دیں یا بے معنی کوششوں
کے پیچھے مرجائیں آخر کیا کریں ؟ اس بیکاری کا جو علاج ہے وہ ہندوستانیوں
سے عمر بھر نہیں ہوسکتا اور اگر ہوسکتا ہے کہ دیکھیں، ہم بھی چاہیں کہ یورپ کے
مردوں کی سی غیرت اور حمیت پیدا کر کے دکھائیں اور اپنے آپ کو عورتوں
کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اگر یہ نہیں ہوسکتا، تو آج سے بیکاری کا رونا
چھوڑ دیں جب یہ معلوم ہے کہ موجودہ دور "دورِ النساء" ہے تو پھر بیکاری دُور
کرنے کی جدوجہد کرنا فطرت سے جنگ کرنا ہے یا نہیں ؟

کیسی بیکاری اور کیسی کچھ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جس قدر بیکاری میں
انسان کثیر المشاغل ہوجاتا ہے باکاری میں قطعاً نہیں ہوسکتا۔ بیکاری
خود ایک ایسا مشغلہ ہے کہ انسان کو اس سے کبھی فرصت نہیں ملتی

یقین نہ آتا ہو تو کسی بیکار انسان کا صرف ایک ہفتہ کا پروگرام دیکھ لیجئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کیا اتنے کام آپ زندگی بھر بھی کر سکتے ہیں ؟ یقیناً اگر آپ کو آپ کی دُگنی عمر بھی ملتی تو شاید آپ اس ایک ہفتہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً ایک شخص بیکار ہے اور اُس کو کسی مشغلے کی فکر ہے۔ وہ سب سے پہلے ڈپٹی کلکٹری سے لے کر ڈسپنسری تک کے لئے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملازمت مل جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ارادہ ہے کہ آٹا پیسنے کی چکی لگا کر قسمت آزمائی کریگا۔ اور اس سلسلے کا تمام حساب و کتاب مرتب ہو چکا ہے لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر حیدر آباد میں کوئی ملازمت مل گئی تو اس کو ترجیح دی جائیگی۔ ایک طرف یہ بھی دل چاہتا ہے کہ اگر سستی مل جائے تو ایک لاری خرید لی جائے، بڑے نفع کی چیز ہے لوگوں نے ایک لاری خرید کر اتنا نفع اُٹھایا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کے پاس دس دس لاریاں ہوگئیں اور وہ لکھ پتی بن گئے۔ لیکن اگر ریلوے اسٹیشن پر کتابوں کے فروخت کرنے کی اجازت مل جائے تو کیا کہنا ہے۔ دُگنا اور چوگنا فائدہ ہے اور یہ ہڈی کا کاروبار بھی بڑے نفع کی چیز ہے۔ پس انسان مستقل مزاج اور محنتی ہو پھر روپے کی کوئی کمی نہیں

اور ان سب سے اچھا تو یہ ہے کہ ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال لیا جائے اور اگر خدا توفیق دے تو روزانہ اخبار سے تو کوئی بہتر بات ہی نہیں مختصر یہ کہ اس کے جتنے ارادے ہوتے ہیں سب اپنی اپنی جگہ مستقل اور اس کا ذہن ہر جگہ کام کرتا ہے۔ یہ خیالی اسکیمیں جب عمل میں آجاتی ہیں اُس وقت کچھ نہ پوچھئے کہ کیا حال ہوتا ہے وہی بیکار انسان بیک وقت ڈپٹی کلکٹر سے لے کر تمام ان عہدوں پر جن کے نام اس کو یاد ہیں ملازم ہو گا۔ بجلی کا بلا شرکت غیرے مالک ہو گا۔ ریاست حیدرآباد میں اس طرح ملازم ہو گا کہ عنقریب کوئی "یار جنگ" ہونے کی بھی اُمید ہو گی لاری بلکہ لاریوں کا مالک ہو گا۔ ریلوے اسٹیشن کی ٹھیکیداری کا شرف بھی حاصل ہو گا۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں اس کے دماغ کی رسائی ہوئی ہو گی بس وُہ اپنے نزدیک وہاں تھوڑی دیر کے لئے عالمِ تخیّل میں سہی بہرحال کامیاب ضرور ہو گیا ہو گا۔ اور اس فریبِ خیال نے اس بیچارے کی حالت اُس کتّے کی سی بنا دی گئی ہو گی جو شیش محل میں ہر طرف اپنی صورت دیکھ کر باؤلا ہو جانے کے قریب ہو۔ یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ کم یا زیادہ دُنیا کے ہر بے روزگار میں پائی جاتی ہے مگر تعلیم یافتہ بیروزگار میں فرق موجود ہے فرق یہ ہے کہ جو ذرا سمجھدار ہیں لیعنی جن پر بیکاری کا ہلکا سا حملہ ہوا ہے یا جنہوں نے اس حملہ کا کامیاب مقابلہ

کیا ہے وُہ تو خیر اس قسم کی تمام تجاویز اپنے ذہن میں رکھیں گے اور اُن کے یہاں تمام صلاح مشورہ بس دل اور دماغ کے درمیان ہوگا۔ یعنی اُن کی اسکیمیں اوّل تو کسی کو معلوم نہیں ہونگی اور معلوم بھی ہونگی تو مخصوص لوگوں کو لیکن وُہ لوگ جو فطرتاً کمزور واقع ہُوئے ہیں یا جن کو بیکاری نے ہر اعتبار سے ضعیف بنا دیا ہے۔ اس معاملے میں اسی قسم کے انسان ثابت ہونگے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی ان کے پاس جائیے تو السلام علیکم وعلیکم السّلام کے بعد جو اس مخصوص مبحث پر گفتگو شروع ہوگی تو اس وقت تک سلسلہ جاری رہے گا جب تک آپ خود "اجازت ہے" ؟ نہ کہیں اور پھر اس گفتگو میں جس بیساختگی کے ساتھ متکلّم محو اور بیخود ہو جاتا ہے۔ اس کا تعلّق بس دیکھنے سے ہے۔ اس وقت اگر آپ نے اس بیچارے کی گفتگو توجہ کے ساتھ سُن لی تو آپ کا یہ احسان وُہ عمر بھر نہیں بھُول سکتا، بلکہ آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ واقعی یہ بیچارہ صرف میری وجہ سے اب تک زندہ ہے ورنہ نہیں معلوم کب کا اس خود غرض دُنیا کو چھوڑ چکا ہوتا، آپ کی صورت دیکھتے ہی وُہ فوراً آپ کی طرف بڑھے گا کہ "السلام علیکم۔ بھائی عید کا چاند ہو گئے کہو کیسی طبیعت ہے اور بھاوج کا کیا حال ہے ؟ اگر اس کے جواب میں کہیں

آپ نے اس کا حال بھی پوچھ لیا کہ "خدا کا شکر ہے بھائی۔ اچھا ہوں۔ گھر میں بھی خیریت ہے۔ تم اپنی کہو کہ اس درخواست کا کیا ہوا" بس اسی قدر کافی ہے۔ گویا آپ نے اجازت دے دی کہ ہاں سناؤ "داستان امیر حمزہ" بس اس نے کہنا شروع کیا :-

"تم کو نہیں معلوم ہوا۔ لاحول ولا قوۃ، اماں اُس نے تو بہت طول کھینچا، ہوا یہ کہ ڈپٹی صاحب نے اس کو کمشنر صاحب کے پاس بھیج دیا اور کمشنر صاحب نے لکھ دیا کہ جو چاہو کرو، ہم نہیں جانتے۔ اب ڈپٹی صاحب کی پھونک نکل گئی کہ کہیں کمشنر صاحب نے غصے میں تو نہیں لکھا۔ میں جب گیا تو کہنے لگے ڈپٹی صاحب کہ کمشنر صاحب نے نامنظور کر دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ ہو کیونکر سکتا تھا۔ جب یہ کمشنر صاحب بریلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے تو میں نے اُن کو بڑے دن کا کارڈ بھیجا تھا۔ وہ مجھ کو جانتے ہیں۔ خیر بھائی تو میں چُپ ہو رہا اور میں نے وہی ٹھیکہ والی کوشش شروع کر دی۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ دکان کی فکر بھی کرتے رہو۔ تو بھائی میں اس طرف سے بھی غافل نہیں۔ اب جو کچھ بھی خدا کر دے مگر آپ کی دُعا سے اُمید ہے کہ سب کچھ ہو جائے گا۔ دکان امین آباد میں

ہے جس میں چادریں، مگر وہ جن کے پاس ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ میری ذاتی ہے۔ میں اس کو خالی نہ کرونگا۔ یہ بڑی مشکل ہے اگر کہیں وہ اس کی فوراتی نہ ہوتی تو بس مار لیا تھا۔ مگر اب کیا ہو؟ اور خوب یاد آیا۔ یار وہ دواؤں والی ترکیب تو ایسی لاجواب ہے کہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ بس تمام ہندوستان کے اخباروں میں اشتہار چھپوا دیئے ہیں۔ پھر کیا ہے جب فرمائش آئی۔ لیا کوئلہ اور دیوار کا پلاسٹر اور دونوں کو ملا کر پیس لیا۔ بس دوا تیار ہے' تو یار ایک دن بیٹھ کر اشتہار بنا ڈالو۔ مگر تم تو ملتے ہی نہیں اور وہ سنگر کمپنی کی ایجنسی بھی یوں ہی رہ گئی۔ تم اپنے وعدوں کو بالکل یاد نہیں رکھتے۔ اچھا تو کل کی رہی۔ ضرور دیکھو، فرق نہ ہو۔"

یہ تمام تجاویز تھیں جن کی تحریک یا تائید میں آپ شریک تھے یا جن کا آپ سے کوئی تعلق تھا۔ ورنہ اُن حضرت کے ذہن میں تو نہیں معلوم کتنی تجاویز ایسی بھی ہونگی جن سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن آپ کی طرح کے دوسرے ہمدردوں کو دلچسپی ہے۔ مثلاً کسی نے تو یہ رائے دی ہوگی کہ ایک ہوٹل کھول لو۔ اب اس شخص سے جو گفتگو ہوگی وہ تمام تر

ہوٹل کے متعلق ہوگی۔ کسی دوسرے شخص نے واشنگ کمپنی کھولنے کی صلاح دی ہے تو اُس سے واشنگ کمپنی کے متعلق تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری ہوگا کہ دھوبیوں کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔ کتنے دھوبی کافی ہونگے کم از کم تین الماریاں دو بڑی میزیں ایک آفس ٹیبل وغیرہ کی ضرورت ہوگی اور پھر کپڑا دھونے کی جگہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ وہاں پانی کی فراوانی بھی ہو اور وہ جگہ دکان سے قریب بھی ہو۔ مختصر یہ کہ تمام نشیب و فراز صرف ایک تجویز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس تجویز کا تعلق بھی صرف ایک کرم فرما سے ہے۔ اسی طرح جتنے خدا نے ہمدرد پیدا کئے ہیں۔ اسی قدر مختلف تجاویز بھی ہیں لیکن ان حضرت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی ہمدردی قبول اور ہر کام کو شروع کرنے کے لئے اس طرح آمادہ کہ بس گویا کل ہی سے شروع بھی ہو جائیگا۔ اگر آپ کو اپنی بتائی ہوئی ترکیبوں کے علاوہ ان تمام تجاویز کا علم ہو جائے جو آپ کے بے روزگار دوست کے ذہن میں ہیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ شخص ایسا دماغ رکھتا ہے جو خزانہ ہے تجاویز کا اور ہر تجویز کے ساتھ ایسی مکمل معلومات اس کے ذہن میں محفوظ ہیں کہ وہ زندہ "انسائیکلوپیڈیا" بن کر رہ گیا ہے اور یہ سب اسی

بیکاری کے طفیل میں ہوا ہے جس سے وُہ کسی نہ کسی طرح چھوٹنا چاہتا ہے۔

یہ جو آپ کثیر التعداد ادبی رسالے دیکھ رہے ہیں اور جو ہنیشاً نکل آئے گویا کہ مٹی کے "بڑ" کی طرح کے انشا پرداز پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کے متعلق اگر آپ تحقیقات کرینگے تو ان کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب نیا وہ تر بھی بیکاری ہوئی ہو گی۔ انہوں نے بیکار ہونے کے بعد یہ سوچا کہ کچھ کرنا چاہیئے اور کسی نے اُن کو رائے دے دی کہ ادیب بن جاؤ۔ مضمون لکھا کرو۔ بس اُنہوں نے لکھنا شروع کر دیا، اور ان ہی کی ترکیب کے پیدا ہونے والے رسالوں نے اُن مضامین کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس "کند ہمجنس باہمجنس پرواز" کا نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ حضرت جن کو حقیقتاً ادب سے کوئی تعلق نہ تھا ادیب بن گئے اور وُہ رسالہ جو نہیں معلوم کیا تھا، علمی، ادبی رسالہ بن گیا۔ اب کر لیجئے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ :-

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کہہ کر اپنی "شوکت تھانویت" سے مستعفی ہو جائیں لیکن وُہ لوگ تو آپ کی وجہ

سے مضامین لکھنا چھوڑ نہیں سکتے۔ جنہوں نے اپنی بیکاری کا علاج اسی کو سمجھا ہے اور جو اپنا پہاڑ کی طرح نہ کٹنے والا وقت مضمون لکھ کر کاٹتے ہیں ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ اگر ہم غیرت دار ہیں اور وہ حضرات مستقل مزاج، لیکن اگر اسی کے ساتھ ساتھ "ایڈیٹر صاحبان رسالہ جات" کی قدر شناسیاں بھی باقی ہیں تو ہم واقعی ایک ایسا اعلان کرنے کے بعد غائب ہو جائیں گے کہ سب نچے دل سے کم از کم ایک مرتبہ یہ کہدیں کہ ع۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اُن کا بھی زمانہ تھا

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب زندگی کی ضروریات کو تفریحات کا اور تفریحات کو ضروریات کا درجہ حاصل تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا کہ ضروریات چنداں ضروری بھی نہ تھیں یا اگر ضروری تھیں تو یہ خود اُن ضروریات کا فرض تھا کہ وُہ پُوری ہوتی رہیں۔ یہ نہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر اپنی ضروریات پُوری کرنے کے لئے کولھو کے بیل کی طرح دن رات جُتا رہے اور تفریحات کا اُسے وقت ہی نہ ملے۔ اُس زمانے میں وقت کاٹنے کے لئے نت نئی تفریحات سوجھا کرتی تھیں اور اب چونکہ وقت کٹ کٹا کر نہ ہونے

کے یرا بر محدود رہ گیا ہے لہذا تفریحات تو نہ جانے کہاں تفریح کرنے نکل گئی ہیں اور ضروریات نے انسان کو ہر طرف سے گھیر کر صرف اس ایک کام کی طرف لگا دیا ہے کہ کسی طرح زندہ رہنے کی مہلت اور زندگی کے بہانے حاصل کرتا رہے۔ ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ زندہ رہنے کا وقت بھی بیچارے انسان کو مشکل ہی سے ملتا ہے اور نہ اُس نے اپنی ضروریات میں موت تک کو شامل کر رکھا ہے۔

یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ اشرف المخلوقات جانوروں کی طرح خود اپنے چارے کی فکر کرے۔ نون تیل لکڑی کے اُلجھاؤ میں پھنسا رہے اور روٹی کپڑے کی پریشانیاں حل کرتا پھرے یہ کام تو جانور بھی کر لیتے ہیں ہم اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ کالجوں میں زندگی ختم کرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں سر کھپاتے ہیں۔ اس کے بعد مر مر کے اس قابل ہو سکتے ہیں کہ اپنی ضروریات زندگی کو بمشکل تمام پورا کر سکیں۔ حالانکہ بندروں کا کوئی کالج نہیں ہوتا۔ گائے بھینسیں کسی اسکول میں نہیں پڑھتیں۔ کتنے بلیاں کسی یونیورسٹی سے ڈگریاں نہیں لیتیں مگر زندہ سب رہتے ہیں۔ پیٹ سب کا بھرتا ہے۔ پیٹ بھر لینے کی فکر ہی اگر انسانیت کی دلیل ہے تو جانور انسان سے

کہیں زیادہ انسانیت کے حقدار کہے جا سکتے ہیں. جن کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے نہ کسی ڈگری کی ضرورت ہے نہ کسی راشن کارڈ کی نہ نقد کا سوال ہے نہ اُدھار کا جھگڑا۔ نہ گرانی سے کوئی سروکار ہے نہ ارزانی سے کچھ مطلب۔ سچ پوچھئے تو جس انسان نے محض اپنے پیٹ کے مسئلہ کو دُنیا کے تمام مسائل پر حاوی کر دیا ہو وہ مستحق بھی اسی کا ہے کہ اس کی سب سے بڑی ضرورت بھوک ہو اور اسی بھوک کا آخر وُہ خود نوالہ بن کر رہ جائے۔

مگر انسان کا یہ حال ہمیشہ سے نہیں ہے۔ انسان پر بھی انسانیت کا ایک دَور ایسا گذرا ہے جب بھوک کے علاوہ دنیا میں اور چیزیں بھی تھیں۔ پیٹ خود بخود بھر جایا کرتا تھا اور پیٹ بھر جانے کے بعد اس کو دُور کی سُوجھا کرتی تھی۔ یعنی یہ اُس دَور کا ذکر ہے جب دماغ اور معدہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تھیں اور اُن دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ آج کل اوّل تو یہ ہوتا ہے کہ ایک غریب آدمی کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو اس طرح کہ معدہ دماغ میں ہے یا دماغ معدے میں اوسط درجہ کے انسانوں کے پاس یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ضرور ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے سے انتہائی وابستہ یعنی انسان دماغ کو اس لئے کام

میں لانا ہے کہ معدے کی خانہ پُری ہوتی رہے اور معدے کی خانہ پُری اس طرح کرتا ہے کہ دماغ کو تقویت پہنچتی رہے۔ اس کلاس کے علاوہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ قدرت نے تقسیم کار کے وقت کسی کو محض دماغ دے دیا ہے اور کسی کو محض معدہ جس کے پاس محض دماغ ہے وُہ سب کچھ کر سکتا ہے علوم و فنون کے خزانے بھر دیگا مگر موت واقع ہوگی غریب کی فاقہ سے اور جس کے پاس معدہ ہے اس کو ہر تکلیف پہنچ سکتی ہے سوائے ایک بھوک کی تکلیف کے اور اُس سے دُنیا کا کوئی اور کام ہو ہی نہیں سکتا۔ سوائے اپنا پیٹ بھر لینے کے اس کا مقصد زندگی ہوتا ہے کھانا اور موت آتی ہے معدے ہی کی کسی خرابی کے ماتحت۔

مگر ہم اُس دَور کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جب دماغ بھی تھا اور معدہ بھی مگر دونوں اپنی اپنی حدوں میں تھے نہ دماغ پر معدہ حاوی تھا نہ معدہ پہ دماغ۔ دُور کیوں جایئے اپنے لکھنؤ ہی کو لے لیجئے۔ عشقِ بتاں تو خیر ضرور تھا مگر فکرِ معاش کی طرف سے اطمینان تھا۔ پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ روپیہ کا کال نہ تھا۔ انسان اور بیل میں نہایت آسانی سے امتیاز ہو سکتا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ روپیہ کا مقصد ہی دوسرا تھا۔ یعنی روپیہ جمع کرنے کیلئے

نہ تھا بلکہ صرف کرنے کے لئے تھا۔ جن کے پاس روپیہ تھا وہ روپیہ صرف کرنے ذرائع ڈھونڈتے تھے اور جن کے پاس روپیہ نہیں تھا وہ یہ ذرائع پیدا کرکے روپیہ حاصل کرتے تھے اور روپیہ حاصل کرکے خود ویسے ہی ذرائع اپنے روپیہ کے لئے ڈھونڈا کرتے تھے گویا روپیہ کا سیلاب امنڈتا تھا۔ دریاؤں میں تقسیم ہوتا تھا۔ دریا نہروں کو بھر دیتے تھے۔ نہروں سے نالے نکلتے تھے اور اسی طرح گوشہ گوشہ سیراب ہوتا چلا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی اور بیفکری تفریح کی ماں کا نام ہے لہذا بے فکر دولتمند تفریح کے متلاشی تھے اور نادار ضرورتمند ان تفریحات کے موجد اور ایسے ایسے موجد کہ قربان جائیے ان کی ایجادوں کے اس انسان کو جسے دراصل انسانوں سے دلچسپی حاصل کرنے کا سلیقہ بھی مشکل سے حاصل ہو سکتا تھا، جانوروں تک سے دلچسپی لینا سکھا دیا۔ کسی کو بٹیروں کے عشق میں مبتلا کر دیا تو کسی کو مرغ کی محبت میں پھنسا دیا۔ کسی کے لئے روپیہ بہانے کا بہانہ ایک حقیر سی چڑیا بٹیر بن گئی تو کسی کا روپیہ کنکوؤں کے بہانے اڑنے لگا اور پھر ان ہی تفریحات کو ضروریات کا اور ان ہی بے فکریوں کو فکر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بٹیر سے کھلونے کی طرح کھیلنے والے اسی بٹیر سے خوش ہونے کے علاوہ اسی بٹیر

کے سلسلہ میں زمانے بھر کی فکریں بھی مول لیا کرتے تھے۔ آج نواب صاحب کا بٹیر رستم زماں علیل ہے۔ کل اس کا مسہل تھا۔ آج اس کا علاج فلاں ماہر "امراض بٹیریات" کر رہے ہیں تو کل بٹیروں کے محکمۂ حفظانِ صحت کے انچارج کابکوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ آج بٹیر نے پالی مار لی ہے تو ڈیوڑھی پر جشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اچھا خاصا نواب زادہ صاحب کی سالگرہ کا جلسہ ہے کیا مجال کہ کسی کو شبہ بھی ہو جائے کہ یہ سب کچھ ایک بٹیر کے سلسلہ میں ہو رہا ہے اور بٹیر ایک کم حقیقت چڑیا کو کہتے ہیں۔

نواب صاحب نہایت نڈھال، پژمردہ کھوئے کھوئے سے محلسرا سے برآمد ہوئے۔ حاضر باشوں اور مصاحبوں کو فکر ہے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے فکر اور ہمارے حضور کے پاس یہ انہونی کیسے ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے کسی مصاحب نے دست بستہ عرض کیا "قربان جائیے یہ خانہ زاد سرکار کے سرِ عزیز کی قسم اب ہماری زندگی تو گویا بیکار ہی ہوئی کہ ہمارے ہوتے سرکار کے چہرہ پر فکر کے آثار ہوں۔ ہماری آنکھیں سرکار کے دشمنوں کو اس طرح بجھا بجھا سا دیکھیں۔ مگر اللہ جانتا ہے کہ یہ قلق بھی ہمارے لئے موت سے کم نہیں ہے کہ حضور نے ہم سے بھی کوئی بات چھپائی ہے آخر ہم اس سرکار کے

نمک خوار ہی تو نہیں جاں نثار بھی تو سمجھے جاتے تھے مگر یہ بھی ہماری قسمت اب ہماری جاں نثاری کا بھرم بھی حضور کی نظر میں مشکوک ہے۔"

سرکار پر فوراً یہ جادو چل گیا۔ چہرہ پر ایک ہلکی سی تبسّم نمودار ہوا اور مصاحب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ تمہاری بھی کیا باتیں ہیں میر محمد و۔ اب تم ہی بتاؤ کہ نوشیرواں کی طویل علالت آخر کہاں تک اثر نہ کرے۔ کلیجہ پتھر تو ہو نے سے رہا۔ جو کچھ بشری طاقت میں ہے۔ سب ہی ہو رہا ہے دعا تعویذ۔ دوا علاج مگر اُس کی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ ہر وقت آنکھیں بند کئے پڑا رہتا ہے نہ دانا ہے نہ پانی ہے۔ مجھ سے تو ان کی طرف دیکھا بھی نہیں جاتا دل کو ایک ہول سا ہے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ خدا کو کیا دکھانا منظور ہے"

اب بتایئے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سنجیدگی، یہ تاثر اور یہ سوز جو اس مکالمہ میں ہے کسی جانور کے لئے ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں دراصل سرکار کے لختِ جگر کا نامِ نامی ہے مگر نہیں یہ بٹیر کا نام ہے جو آج کل اپنے کابک میں صاحب فراش ہے اُسی کے لئے صحت کی دعائیں ہو رہی ہیں۔ خیرات بٹ رہی ہے۔ حاضر باشوں سے لے کر خود سرکار تک کی رات کی نیند اور دن کا آرام حرام ہے۔ اگر یہ اچھا ہو گیا تو

جشنِ صحت منایا جائیگا۔ دھوم دھام سے غسلِ صحت ہوگا۔ دعوتیں ہونگی۔ جلسے ہونگے۔ تبل ماش آئیں گے اور اگر خدانخواستہ دورپار دشمنوں کے کان بھرے۔ بٹیر نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا تو شاعر قطعہ تاریخ وفات کہیں گے سرکار کے پاس تعزیت نامے آئیں گے۔ لوگ دُور دُور سے ماتم پُرسی کو آتے رہیں گے۔

مقصد یہ کہ تفریح کو اس حد تک سنجیدگی دے دی جاتی تھی کہ ضروریا بھی اس کے سامنے غیر ضروری نظر آنے لگے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ کرکٹ میچ ہوگیا، تالیاں بجا دی گئیں۔ جیتے تو جیتے اور ہارے تو ہارے نہ جیت کی کوئی خوشی نہ ہار کا کوئی ملال اُس وقت تو ہار اور جیت موت اور زندگی کی قسم کا ایک مستقل سوال تھا۔ آج کل تو میونسپل الیکشن اور کونسل تک کے انتخابات میں وُہ سنجیدگی اور وُہ اہمیت نظر نہیں آتی جو اُس زمانہ میں بٹیر کی ایک پالی یا کنکوے کے ایک میدان میں نظر آتی تھی۔ اچھا خاصا عزّت آبرو کا معاملہ ہوتا تھا کہ خدانخواستہ اگر ناکامی ہوئی تو کسی کو منہ دکھاتے نہ بن پڑے گا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ دو مشہور و معروف کھلاڑیوں نے ٹینس کا میچ کھیلا ایک جیتا اور ایک ہار گیا۔ اب ہارنے والا ہاتھ بھی ملاتا ہے

تصویر بھی کھنچوانا ہے اور ہنسنا بھی ہے۔ یہ تمام باتیں دلیل ہیں اس ایک بات کی کہ تفریحات کو کس قدر غیر اہم سمجھ لیا گیا ہے۔ کھیل کود کو بھی فن کا درجہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کھیل کو بھی بچوں کا کھیل نہ سمجھا جائے مگر اس سنجیدگی اور اس انہماک کی اجازت اور مہلت موجودہ زمانہ کیونکر دے سکتا ہے جبکہ حال یہ ہے کہ ٹینس کا کھلاڑی وکالت بھی کرتا ہے اور ٹینس بھی کھیلتا ہے۔ کرکٹ کا ایک ماہر صرف کرکٹ ہی نہیں کھیلتا۔ دفتر میں ملازم بھی ہے۔ فٹ بال کا ہیرو دن رات گیند نہیں اچھالا کرتا بلکہ کسی ورکشاپ میں بھی ملازم ہے جہاں غیر حاضری کرنے پر تنخواہ کٹ جایا کرتی ہے۔ اب بتایئے کہ یہ بیچارے اس کھیل کود کو کھیل کود سے زیادہ اور سمجھ ہی کیا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں ایک بٹیر باز کیلئے صرف اسی قدر کافی تھا کہ وہ بٹیر باز ہے اور خاندانی بٹیر باز ہے۔ کنکوا بازی اور کنکوا سازی ایک علیحدہ فن تھا۔ فن تو خیر آج کل بھی ہے مگر اس کے فنکار کچھ اور ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی خوبی ہے کہ پتنگ بازی کا ماہر کنڈکٹری کرتا پھرے اور بٹیروں کا نباض، گھوڑوں کے اسپتال کا کمپاؤنڈر ہو۔ اُس زمانے میں امیروں کی تفریح غریبوں کی روزی تھی۔ قدر دان رئیس ہر صاحبِ فن کی قدر کرتے تھے۔ بٹیر باز

اگر اپنے فن کا اُستاد ہوتا تھا تو اس کو صرف اسی بہانے دولت حاصل کرنے کے مواقع حاصل رہتے تھے۔ اسی طرح پہلوان اور موسیقی کے اُستاد۔ پیر اک اور پٹے بازی کے ماہر مصوّر اور شاعر۔ رقاص اور نقال مختصر یہ کہ کس کس تفریح کا ذکر کیا جائے ہر تفریح اپنی جگہ ایک مستقل فن تھی اور اس کے فنکار اپنی قلمرد کے گویا حکمران سمجھے جاتے تھے امراء کی تفریحات ان کی ضروریات تھیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو خود امراء کے ذہن میں بھی یا تو تفریح کا مفہوم نہ تھا یا ضرورت کا وُہ مطلب نہ سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی ضروریات میں تفریحات سے زیادہ ضروری تو شاید اور کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب غلّہ سے زیادہ ہاضمہ درست رکھنے والی دواؤں کی ضرورت رہا کرتی تھی اور پیرچون کی دکانوں سے زیادہ چورن کے کارخانوں کی ضرورت اور مانگ تھی۔

جی ہاں پٹے ہیں

عاشقی میں تو خیر عزّت سادات تک چلی جاتی ہے اور اس طرح
کہ گویا بات ہی نہیں لیکن اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ مزاح نگاری میں بھی
ناک کا جڑ سے صاف ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ رہے گی اور واقعی جب
خود مزاح نگار اپنی برادری کی عزّت و آبرو کے درپے ہو جائیں گے تو ظاہر
ہے کہ مزاح نگاروں کی آبروریزی ہوتے ہوئے کیا دیر لگے گی، چنانچہ ملاحظہ
فرمائیے کہ خود مزاح نگاروں کی برادری کے ایک رُکن برادرم مرزا عظیم بیگ صاحب
چغتائی المتخلص بہ کول تار کو جو مارواڑ میں بیٹھے بٹھائے دل لگی سوجھی تو کلکتہ

کے ظریف اخبار چوپنچ میں یہ تجویز پیش فرمادی کہ ہندوستان کے تمام مزاح نگار
خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سوال کا جواب بصورت مضمون دیں کہ کیا "وہ
کبھی پٹے ہیں" ؟ اور پھر لطف یہ کہ جواب میں بچپن یا طالب علمی کے زمانہ کی پٹائی
سے کوئی بحث نہ کی جائے بلکہ وہ پٹائی جو بچپن اور طالب علمی کے بعد یعنی باعزت
اور باحیثیت ہو کر اپنی حماقت یا دوسروں کی زیادتی کی بدولت ہوئی ہو۔
اب بتایئے کہ یہ بات تمام عزت و آبرو پر پانی پھیر دینے والی ہے یا نہیں؟
اگر ہم جھوٹ بول کر بچنا بھی چاہیں کہ بھائی یہ اتفاق کبھی ہم کو پیش نہیں آیا تو
اس کے واسطے بھی اس ظالم چغتائی نے پیش بندی کر دی ہے کہ "اگر ان
حضرات میں سے کسی صاحب نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ میں کبھی نہیں
پٹا تو بخدا مجھے تو یقین آئے گا نہیں۔ ایسی صورت میں سوائے صاف صاف
عرض کر دینے کے اور کیا چارہ ہے ؟

الوداع اے عزت و آبرو، الفراق اے خاندان بھر کی ناک۔ اگر آپ
ایمان کی بات پوچھتے ہیں تو جی ہاں پٹے ہیں اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ بارہا پٹے
ہیں مگر اس طرح کہ ہم نے بھی پیٹا ہے اور اس پٹنے کے جواب میں۔ ع۔
"کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

خود بھی مار کھائی ہے اور ہماری بھی مرمّت ہوتی ہے لیکن چونکہ اس مضمون میں ہم کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم محض اپنے پٹنے کی داستانیں ملکہ دے عرض کر دیں۔ لہٰذا اپنی شجاعت کے افسانوں کا موقع نہیں ہے تاہم اس مضمون کے پڑھنے والوں کو اپنی اپنی جگہ یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جب لکھنؤ کی فضا میں "گو بیک سائمن سائمن گو بیک" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور سیاہ جھنڈیوں سے کمیشن کا استقبال کرنے والوں کے علاوہ بہت سے تماشائیوں کا بھی چارباغ اسٹیشن کے قریب میلہ لگا ہوا تھا۔ ہم کو بھی روزنامہ ہمدم مرحوم کے دفتر سے اٹھا کر اس محشرستان میں بھیجا گیا کہ تمام واقعات کی عینی شہادت حاصل کریں اور ہم دفتر سے اٹھ کر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس "انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر" میں ایک قطرہ کی طرح شامل ہو گئے۔ سیاہ جھنڈیوں سے فضائیں تاریک ہو رہی تھیں اور "گو بیک" کے نعروں سے زمین اور آسمان ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے ایک طرف تو مجمع کا یہ عالم تھا دوسری طرف پولیس کے لال پگڑی والے پیدل اور سوار مجمع کو آگے

بڑھنے کی کوشش سے روکنے بلکہ پیچھے ہٹانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آرہے تھے۔ بہرحال اسی مواج سمندر میں ہم بھی تھپیڑے کھا رہے تھے کہ ایک دم سے خدا جانے کمیشن آگیا یا قیامت آگئی لیکن ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پولیس والے مجمع پر جھپٹے اور مجمع سے بہت سے لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اس طوفان کی وجہ دریافت کرنے کا ہوش کسے تھا۔ ہم بھی بلا وجہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے مگر بھاگتے کدھر ہر طرف تو انسان ہی انسان تھے جو بھاگنے تک کی جگہ نہ دیتے تھے۔ بہرحال کسی پر گرے کسی کو اپنے اوپر گرایا اور کسی نہ کسی طرح مجمع سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک حد تک بدحواسی کے ساتھ کوشش کرنے لگے لیکن اُدھر سے پنڈت جواہر لال نہرو ڈٹے رہنے پر زور دے رہے تھے اور بہت سے بھاگنے والے اس نازک وقت میں بھی ان کی آواز سننے کا ہوش رکھتے تھے۔ لیکن ہم نے تو طے کر لیا تھا کہ کوئی بھی کچھ کہے مگر بندہ اب یہاں ٹکنے والا نہیں ہے۔ لیکن جناب قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ ہم بھاگ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک ڈنڈا ہمارے رسید کیا جو اتفاق سے ہمارے بھاگتے ہوئے پیروں میں سے ایک پر پڑا اور سچ پوچھئے تو خدا

نے بڑا فضل کیا ہم بال بال بچ گئے۔ اب ہم ایک درخت کے قریب پہنچ کر ذرا اپنے پیر سہلا رہے تھے کہ ایک گھوڑے سوار لال پگڑی والے نے کچھ ہماری شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے کے بعد اس زور سے بلّم رسید کیا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور اپنے شہید ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد مطمئن ہو گئے لیکن آنکھ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بلّم درخت پر اس طرح پڑا تھا کہ ہم صاف بچ گئے تھے۔ لیکن جناب اس حادثہ کے بعد جو ہم بھاگے ہیں تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے اور دفتر میں آکر دم لیا۔

غالباً ہمارے پٹنے کا یہ واقعہ تو قومی نقطۂ نظر سے بجائے باعثِ شرم ہونے کے باعثِ فخر ہے بلکہ اگر درخت کے حائل نہ ہو جانے سے وہ بلّم ہم پر پڑتا تو آج ہم کو بھی وہی درجہ حاصل ہوتا جو لالا جپت رائے آنجہانی کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد واقعات قومی اور غیر قومی ہر نقطۂ نظر سے شرافت پر پانی پھیر دینے والے ہیں مگر مجبوری ہے کیا کیا جائے لہٰذا سنیئے اور ہماری نجابت کی داد دیجیے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست سے اسی قسم کے معاصرانہ تبادلہ کی نوبت آ گئی۔ اُن دوست کا نام بتانے میں ذرا ہماری توہین ہوتی ہے۔ بہر حال

خود واقعہ بھی کچھ کم نہیں ہے اور مطلب تو صرف یہ بیان کرنے سے ہے کہ ہم کیونکر پٹے۔ قصّہ اصل میں یہ تھا کہ ہمارے وُہ کرمفرما ذرا ذرا سی بات پہ برہم ہوکر بہت سے ایسے واقعات دہرانا شروع کر دیتے تھے جو ہماری دُکھتی ہوئی رگ والے واقعات ہوتے تھے۔ لیکن اس بندۂ خدا کو خدا معلوم اس میں کیا لطف آتا تھا کہ لڑائی تو ہوئی آم کے سلسلے میں اور دُکھڑا رونا شروع کیا اُنھوں نے املی کا۔ چنانچہ جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں وُہ بھی اسی طرح رُونما ہُوا کہ وُہ اپنے چند دوستوں کے سامنے قابلیت بگھار رہے تھے کہ ہم بھی جا پہنچے اور لگے ان کی قابلّیت کا بھانڈا پھوڑنے اُس وقت تو خیر وُہ اس طرح خاموش رہے کہ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا لیکن جب ان کے دوست اُٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے اپنی برہمی کا اظہار شروع کر دیا اور ہمارے اس سوال پر کہ کیوں چُپ کیوں ہو؟" وُہ برس پڑے کہ :۔

"میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر آپ کی سنجیدگی کا یہی حال ہے کہ آپ کو آتے گئے لوگوں کا بھی خیال نہیں تو آپ مہربانی فرما کر مجھ کو معاف رکھیں۔ خود آپ کی تو خیر کوئی پوزیشن ہے ہی نہیں لیکن آپکے دوسرے

کی پوزیشن کا بھی خیال نہیں ہے تو جناب میں باز آیا"

اب بتایئے ان حضرت کے یہ الفاظ کس قدر مشتعل کرنے والے تھے۔ لیکن چونکہ غلطی خود ہماری تھی لہذا ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا:۔

"جناب والا مجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کی طبع نازک کو میرا مذاق اس قدر گراں گزرے گا اگر آپ نہیں ملنا چاہتے تو بسم اللہ"

وہ "آپ نے آج ہی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہے بلکہ اب تو یہ آپ کی عادت ہوتی جاتی ہے اور اگر یہی حال ہے تو انشا اللہ میں کیا کوئی بھی منہ لگانا پسند نہ کریگا۔

میں۔ بندہ نواز معاف فرمایئے گا۔ آپ کی طرح کوئی اور خرد ماغ نہیں رہ گیا ہے آپ تو میں نے خود کان پکڑے کہ اب کبھی نہ ملوں گا۔

وہ۔ اب آپ کہلواتے ہیں تو سنیئے کہ آپ کے تمام دوست جن سے ذرا بھی سنجیدگی چھو گئی ہے آپ سے نالاں ہیں۔ اور کوئی آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور واقعی اس لونڈے پن کو کہاں تک برداشت کرے"۔

میں۔" میرا لونڈا پن آپ کی خرد ماغی سے پھر بھی اچھا ہے اور معلوم نہیں

آپ کو کس بات پر اتنا ناز ہے۔ اگر کچھ ہوتے تو خدا جانے کیا کرتے کچھ نہ ہونے پر تو یہ حال ہے"۔

وُہ۔ "میں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو سننا نہیں چاہتا"۔

مَیں۔ "میں آپ کے ایسے بدتمیزوں سے گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتا"۔

وُہ۔ "آپ اپنی زبان کو روکیے ورنہ اس گستاخی کی سزا کو پہنچیے گا"۔

مَیں۔ "اپنے حواس میں رہو۔ حد سے نہ بڑھو۔ ورنہ یہ تمام اکڑ دھری رہ جائیگی"۔

وُہ۔ (گلا پھاڑ کر) خاموش ——— بدتمیز کہیں کا۔

مَیں (گلا پھاڑ کر) چُپ ——— بیہودہ ——— بدتمیز کہیں کا ——— تم خود بدتمیز۔

اس کے بعد پہلے وُہ کرسی سے کھڑے ہوئے اور اُن کے بعد ہم۔ سب سے پہلے تو بیچ میں رکھا ہوا حقّہ گرا اس کے بعد ہم اور وُہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ ہم کمزور ہیں۔ دُبلے پتلے ہیں اور وُہ ہاتھ پیر کے اچھے تھے لیکن غصّہ اور اشتعال، اشتعال اور غصّہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا، چنانچہ ہم نے میز سے کرسی اور کرسی سے آرام کرسی پر گرنا شروع

کیا۔ لیکن ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس جوش کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ اب کی یا تو ہم ہی نہیں یا وہ مردود نہیں لیکن سچ ہے کہ کمزوری مار کھانے کی نشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ آخر میں انہوں نے ہم کو مسہری پر گرا کر ایک آدھ ایسا گھونسا رسید کیا کہ ہم کو جوابی گھونسے کا ہوش نہیں رہا اور ہم نے ان کے گھٹنے سے دبے ہوئے سینہ سے بمشکل آواز نکال کر کہا:۔

"یہ شرافت ہے، کمینہ پن، شہد پن، بدمعاشی۔"

اور اس کے بعد انہوں نے جب ہم کو چھوڑا۔ تو ہم مقابلہ پر نہیں آئے بلکہ نہایت جوش کے ساتھ تنتنا تے ہوئے اُن کے کمرہ سے نکل گئے اور اس واقعہ کے دو مہینے بعد تک ہم دونوں آپس میں نہیں ملے۔ لیکن یہ واقعہ آج ہمارے قلم سے نکلا ہے ورنہ اُسی دن جب گھر میں سب نے پھٹے ہوئے کپڑے اور چوٹیں دیکھیں اور سبب پوچھا تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ ایک پاگل کُتا لپٹ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہم گرے بھی اور اُس نے ہمارے کپڑے بھی نوچے لیکن اس کا دانت کہیں نہیں لگا۔ مگر آج یہ راز کی بات ہماری زبان سے نہ سہی۔ بہرحال ہمارے قلم سے نکل رہی ہے۔ اب چاہے ہم کو کوئی ذلیل سمجھے یا کمینہ!"

ایک مرتبہ ریل میں ہماری شامت آئی اور وہ اس طرح کہ ہم غالباً لکھنؤ سے بھوپال جارہے تھے چنانچہ صبح کے وقت جب لکھنؤ جھانسی ایکسپریس سے اتر کر دہلی بمبئی ایکسپریس پر بیٹھے تو بڑی کشمکش تھی اوّل تو تیسرے درجہ میں ہمیشہ کشمکش ہوتی ہے لیکن اُس دن کچھ خلافِ معمول کشمکش زیادہ تھی بھی اور مسافر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کے اُوپر ایک سوار تھا۔ لیکن ہم کو بڑی عمدہ جگہ مل گئی تھی اور ہم بڑے مزے میں سفر کر رہے تھے۔ بینا جنکشن پر گاڑی کے ٹھہرتے ہی ہماری جو کمبختی آئی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر آگئے اور اُس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی۔ لیکن اب جو ہم گاڑی میں آکر دیکھتے ہیں تو ہماری جگہ پر ایک اور صاحب نہایت اطمینان سے تشریف رکھتے تھے۔ واللہ ان کا اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ جگہ اُن ہی کی تھی اور ہم زبردستی یا ان کی عنایت سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی نہایت لاپروائی سے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید یہ ہوا کھانے کے لئے آبیٹھے ہیں ابھی اُٹھ جائیں گے لہٰذا ہم نے مارے شرافت کے اُن سے اُٹھنے کا تقاضا بھی

بھی نہیں کیا اور چُپ کھڑے رہے لیکن وُہ اُٹھنے ہی کا نام نہ لیتے تھے یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہو گیا جب ہم نے دیکھا کہ ان کا اطمینان بدستور قائم ہے اور وُہ جگہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تو ہم نے اُن سے عرض کیا :۔

"اب ہٹیے جناب میں بیٹھوں گا۔"

انہوں نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا۔

"اُدھر بیٹھ جاؤ۔"

ہم "آپ ہی کیوں نہ وہاں چلے جائیں میرا تو یہاں سامان وغیرہ رکھا ہے۔"

وہ "سامان رکھا ہے تو ہم کیا کریں؟"

ہم ۔"ارے بھئی یہ تو میری جگہ ہے۔"

وہ ۔"کیا تم نے یہ جگہ خریدی ہے جو تمہاری جگہ ہے۔"

ہم ۔"خریدی تو نہیں ہے مگر میں یہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔"

وہ ۔"تو اب ہم بیٹھے ہیں تم وہاں بیٹھو۔"

ہم ۔"یہ تو اچھی زبردستی ہے۔"

وہ ۔"زبردستی کا ہے کی کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے؟"

ہم ۔ "یہ کون کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے مگر دوسرے کی جگہ پر تو نہ بیٹھیے۔

وہ ۔ "خیر ہم تو نہیں ہٹیں گے"۔

ہم ۔ "ہٹو گے کیسے نہیں"؟

وہ ۔ "اچھا دیکھتے ہیں تم ہٹا لیتے ہو"۔

ہم ۔ "نہیں ہٹو گے"؟

وہ "نہیں"!

ہم ۔ "نہیں ہٹو گے"؟

وہ ۔ "نہیں"!

ہم "کیوں آفت مچاؤ گے ہم پھر کہتے ہیں۔ ہٹ جاؤ۔"

وہ ۔ "کہہ تو دیا ہم نہیں ہٹیں گے"۔

ہم ۔ "تم نہیں ہٹو گے"؟

وہ ۔ "ہاں نہیں ہٹیں گے"!

اب ہم کو بڑا تاؤ آرہا تھا اور ہم مارے غصّہ کے کانپ رہے تھے۔ اس وقت اگر بس چلتا تو اس بدتمیز کو مارتے مارتے فرش کر دیتے۔ مگر کیا کریں سفر کا معاملہ تھا اور ہم تنہا تھے۔ لیکن چُپ ہو رہنا بھی کوئی معنی نہ

رکھتا تھا۔ ہم نے پھر کہا ۔

"تم نہیں ہٹو گے ؟"

وہ "نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔"

اب ضبط ہمارے اختیار میں نہ تھا۔ ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا تو اُس نے ڈھکیل دیا اور ہم سامنے والی سیٹ کے مسافروں پر گر پڑے۔ لیکن اُٹھ کر ہم نے پھر اُس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دے کر کھینچا لیکن اُس نے دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ پر تڑ سے وہ چانٹا رسید کیا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ؎

چمکنے سے جگنو کے تھا وُہ سماں
ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

والا منظر آگیا اور معلوم ہوا کہ جیسے ہم سنیما دیکھ رہے تھے اور یہ فلم جل جانے والا اندھیرا اور روشنی تھی۔ لیکن دو ہی تین سیکنڈ کے بعد ہم پھر اس نامعقول پر جھپٹے اور خدا کی قسم اگر دوسرے مسافر بیچ میں نہ آجاتے تو اس بدمعاش کو مارتے مارتے اُلّو کر دیا ہوتا۔ لیکن ہم کو ہمارے ہمسفروں نے ایسے گھیرا کہ ہم گالیاں تو دیتے رہے لیکن ہاتھ نہ ہلا سکے۔ بہر حال یہ واقعہ

بھی خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن ہمارے مار کھا جانے کے واقعات میں سے ایک ہے۔

ان تین واقعات کے بعد باہر کا تو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا نہیں۔ لیکن گھر میں یہ اتفاق ہوتے ہیں مثلاً شادی ہی میں پھولوں کی چھڑیوں سے پٹے تھے۔ لیکن ہم ان واقعات پر روشنی ڈالنا خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں اس لئے کہ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں وہ تو کہئے برادرم عظیم بیگ صاحب چغتائی کی مروت تھی۔ ورنہ یہی واقعات مرتے دم تک ہمارے قلم یا ہماری زبان سے نہ نکلتے۔

ٹائیگر

مَیں نے کہا "شُوں"

بیگم نے کہا "اُوں"

ٹائیگر میرے قدموں میں پڑا ہوا زبان نکالے ہانپ رہا تھا اور بیگم صاحبہ کے قدم معہ جوتیوں کے مسہری پر رکھّے ہوئے تھے، انہوں نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "مجھے نہیں اچھّا معلوم ہوتا۔"

مَیں نے پیارے ٹائیگر کو دُلار سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ "کون ہے میرا ٹائیگر؟"

جل کر کہنے لگیں۔ "ہاں بھی مُوا، اسے یا تو باہر ہی رکھا کیجئے نہیں تو کسی دن

میرے ہاتھوں اس کی موت آجائیگی"۔

[میں نے دانتوں میں انگلی دبا کر کہا۔ "ارے بیگم یہ کیا کہہ رہی ہو، تم کو اگر ٹائیگر کے احساسات اور جذبات کا احترام نہیں ہے تو کم سے کم میرا ہی خیال کرو کہ مجھ کو کُتّے کی شان میں تمہاری یہ گستاخیاں کس قدر بُری معلوم ہوتی ہونگی، اس قدر عالی خاندان کُتّا، اس قدر قیمتی جانور، اس قدر وفا شعار رفیق اور اس کو تم اس طرح بُرا بھلا کہتی ہو"؟]

جلبلا کر بولیں "ہاں میں تو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اس موے موذی کو کہونگی، اگر آپ کو اپنے کُتّے کا ایسا ہی خیال ہے تو اس کو باہر رکھا کیجئے، گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دونگی"۔

معلوم نہیں بیگم کی اس بداخلاقی پر ٹائیگر اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا، بہرحال خود ہم کو اپنے معزز کُتّے کی اس کُھلی ہوئی توہین پر قلبی اذیت ہوئی اور ہم فوراً "آؤ بیٹا" کہہ کر ٹائیگر کو ساتھ لئے ہوئے باہر چلے گئے اور یہ طے کر کے کہ آج سے بیگم کو ٹائیگر سے پردہ کرائیں گے، چوکیدار سے کہہ دیا کہ دیکھو ٹائیگر کو باہر ہی رکھا کرو اندر نہ جانے پائے اور جب ہم نہ ہوا کریں تو اس کو باندھ دیا کرو"۔

اس دن کے بعد سے ٹائیگر کبھی اندر نہ گیا۔ بیگم کو تو اطمینان تھا لیکن ہم کو اس خانہ جنگی اور فرقہ وارانہ باہمی اختلاف سے سخت تکلیف تھی، ہم چاہتے یہ تھے کہ گھر پر آکر اپنے رفیق ٹائیگر اور اپنی رفیقۂ حیات دونوں سے بیک وقت دلچسپی لیں، لیکن بیگم کی ضد نے ہم کو مجبور کر دیا تھا کہ ہم گھر کے اندر کچھ وقت گذاریں اور کچھ ٹائیگر کے پاس باہر مختصر یہ کہ جس جھگڑے کی وجہ سے ہم ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کے مخالف تھے۔ وہی جھگڑا بغیر دوسری شادی کیئے ہوئے ہمارے گھر میں موجود تھا۔ پھر بھی ہم مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ بیگم کو سمجھا بجھا کر ٹائیگر سے مصالحت کرا دینگے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ گھریلو اختلاف ختم ہو جائے۔

ایک دن صبح کے وقت میز کی ایک طرف بیگم بیٹھی تھیں اور دوسری طرف ہم، چاء نوشی کے ساتھ ساتھ بیگم کو خوش اخلاق اور ملس مکھ پا کر ہم نے ٹائیگر کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے مگر بیگم نے کہا :-

آخر آپ کو یہ مُوا کُتا کیا پسند ہے، مجھ کو تو صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "میں سمجھتا تھا کہ آپ اس کو مذہباً گھر کے باہر رکھنے پر مُصر ہیں آج معلوم ہوا کہ آپ محض ڈرتی ہیں"؟

جلدی سے کہنے لگیں "ہاں مذہباً بھی کُتا گھر میں رکھنا کوئی ثواب نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "ایک بات بتائیے کہ آپ ڈرتی ہیں یا مذہباً کُتّے کو الگ رکھنا چاہتی ہیں"؟

کہنے لگیں۔ "دونوں باتیں ہیں، موئے کی صُورت بھی تو کیسی خوفناک ہے"

ہم نے کہا "نہیں تو اس کو تو بڑی بڑی یوربین عورتیں دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے کتّوں کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ مجھ کو خوش قسمتی سے ایسا کتّا مل گیا ہے، اس کا شجرہ اگر تم دیکھو تو تم کو پتہ چلے گا کہ کتنا عالی خاندان اور نجیب الطرفین ہے۔"

بیگم نے مُنہ چڑھا کر کہا "آگ لگے اس موئے کی شرافت میں اور جھاڑو پھیرے اس کی صورت پر میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ اس سے بلّی پال لیتے، مجھ کو بلّی اچھی لگتی ہے اور وہ ناپاک بھی نہیں ہوتی۔"

ہم نے ہنس کر کہا "بلّی"؟

آواز آئی۔ کھل گیا، کھل گیا۔"

اور بیگم گڑبڑا کر اس طرح کرسی سے اُٹھ کر میز پر چھا نڈ پڑیں کہ ایک بھونچال آ گیا، چائے کے کچھ برتن زمین پر گر کر ایک ایک کے دس دس ہو گئے اور کیتلی مع دودھ دان کے ہماری گود میں اس طرح آ رہی کہ ہم بھی ناچ گئے۔ البتہ ٹائیگر صاحب کرسی کے قریب زبان نکالے ہوئے کمر مٹکا مٹکا کر دُم ہلا رہے تھے اور میز پر چڑھی ہوئی بیگم کے مُنہ سے الفاظ تک نہیں نکلتے تھے۔ ہم بڑی دیر کے بعد سمجھ سکے کہ کیا واقعہ ہُوا ہے اور جب حواس بجا ہوئے تو بیگم کی حماقت پر خاموش ہنسی ہنستے ہوئے ٹائیگر کا پٹہ پکڑ کر باہر چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے ہم کو پورا یقین ہو گیا کہ بیگم اور ٹائیگر کے درمیانی اختلافات کو مٹانا ممکن ہی نہیں ہے، چنانچہ ہم نے پھر اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ البتہ ہم کو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں بیگم صاحبہ ہمارے عزیز از جان ٹائیگر کو زہر نہ دیں یا کسی نوکر کو رشوت دے کر اس کو قتل نہ کرا دیں چنانچہ اس کے لئے تو ہم نے نوکروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ٹائیگر کا بال بھی بیکا ہُوا تو ملازموں میں سے کوئی بھی پھانسی سے نہ بچ سکے گا۔ لیکن

ضرورت اس بات کی تھی کہ بیگم کو بھی اس عذابِ جہنم سے ڈرا دیں جو کتّے کو قتل کرنے یا کرانے یا زہر دینے یا زہر دلوانے کے بعد خدا کے یہاں انسان پر ہوتا ہے، چنانچہ ہم نے بیگم سے کہا۔

"اب ٹائیگر کے لئے باقاعدہ انتظام کر دیا ہے کہ وہ کبھی گھر میں نہ آنے پائے"۔

بیگم نے کہا۔"اب کی آیا تو اس کی قضا بھی آجائیگی"۔

ہم نے کہا"نہیں۔ اب وہ نہیں آئے گا، مگر دیکھئے کہیں آپ حرکت نہ کر بیٹھئے گا کہ اس بے زبان جانور کو زہر دے کر مار ڈالیں، اس لئے کہ بڑا گناہ ہے"۔

بیگم نے لاپرواہی سے کہا"ہاں کتّے کو مار ڈالنا گناہ ہے، اور کتّے کو پالنا تو گویا ثواب ہی ہے"۔

ہم نے وحشت ناک صورت بنا کر کہا"نہیں واقعی کسی بے زبان جانور کو مار ڈالنا تو ایسا گناہ ہے کہ اس کا عذاب جیتے جی گھر بھر کو بلکہ خاندان بھر کو ملتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میر کاظم علی نے اپنے کتّے کو مار ڈالا اس بے زبان کا ایسا صبر پڑا کہ پہلے تو اسی ہفتہ میں ان کا جوان

لڑکا مرا، پھر دوسرے ہفتہ میں جوان لڑکی مع نواسے کے ختم ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد داماد مر گئے، پھر بیوی نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی بلکہ مرتے وقت کتّے کی صورت ہوگئی اور ابھی تین چار دن ہوئے کہ وہ بچارے خود مرے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کا دُم بالکل کتّے کی طرح نکلا ہے بلکہ وہ بھونک بھی رہے تھے۔

بیگم نے خوف کے مارے پھریری لے کر کہا۔ "یا اللہ توبہ ہے۔"

ہم اپنی کامیابی پر دل میں خوش ہوئے اور کہا۔ "واقعی توبہ کا مقام ہے بے زبان جانور کو مار ڈالنا اچھا نہیں ہوتا۔"

بہرحال اس برمحل ترکیب سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بیگم صاحبہ نے قتل ٹائیگر سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن وہ یہ برابر کہتی رہیں کہ "اگر گھر میں آیا تو ٹانگ توڑ دوں گی۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں اگر تم خود ٹانگ توڑنے کی ہمت رکھتی ہو تو میں ابھی ٹائیگر کو حاضر کرتا ہوں۔"

بیگم نے جلدی سے کہا۔ "دیکھئے آپ کو خدا کی قسم جو لائیے۔"

ہم نے کہا۔ "نہیں آپ شوق سے ٹانگ توڑیں" اور یہ کہہ کر باہر کی

طرف بڑھے۔

بیگم نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "دیکھئے اچھا نہ ہوگا"۔

اور ہم ہنستے ہوئے دفتر چلے گئے۔

دفتر سے واپس آکر سب سے پہلے ٹائیگر کی کوٹھری میں گئے۔ لیکن وہاں ٹائیگر کا کہیں پتہ نہ تھا، دل دھک سے ہوگیا کہ ہو نہ ہو آج بیگم نے اس زبان کو خدا جانے کس عذاب میں مبتلا کیا ہوگا، معلوم نہیں مار ڈالا یا کہیں چھڑوا دیا گیا، بہرحال اب ہم کو پورا یقین ہوگیا تھا کہ ہم سے بچھڑا ہوا ٹائیگر اب ہم کو نہ ملے گا، بیگم کے ظلم پر غصہ آرہا تھا اور دل چاہتا تھا کہ ہم بھی گھر میں نہ جائیں، چوکیدار سے پوچھا تو وہ گدھا فوراً دوڑ کر کوٹھری میں گھس گیا جہاں ہم خود دیکھ چکے تھے کہ ٹائیگر نہیں ہے اور وہاں سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوگیا، ہم نے ڈانٹ کر پوچھا "کہاں ہے ٹائیگر"۔

کہنے لگا "حضور ابھی یہیں تھا"

ہم نے گھونسہ تان کر کہا "تو کیا ہوا بتاؤ نہیں تو جان لے لونگا"۔

کہنے لگا "حضور ابھی میں نے اس کو دودھ دیا تھا، کوئی پانچ منٹ ہوئے"

ہم نے کہا "کیا تجھ سے بیگم نے اس کو کہیں چھڑوایا نہیں"؟

کہنے لگا۔ "نہیں حضور"

ہم نے کہا۔ "اچھا ٹھہرو تم ابھی میں بتاتا ہوں" اور ہم خود زن زناتے ہوئے گھر کے اندر گئے کہ آج ٹائیگر کی دشمنی کا بدلا لیں گے اور خود بھی اس گھر سے جدھر منہ اٹھے گا چلے جائیں گے، لیکن گھر میں جا کر عجیب نقشہ دیکھا ٹائیگر صاحب تو نہایت متانت سے بیچ صحن میں کھڑے ہوئے دُم ہلا رہے تھے اور بیگم صاحبہ لاپتہ تھیں۔ ہم نے آواز دی "آپ کہاں ہیں" ؟

جواب آیا۔ "ہٹائیے اس موذی کو"۔

ہم نے پھر آواز دی۔ "آخر آپ ہیں کہاں، میں نے اس کو پکڑ لیا ہے"۔

جواب آیا۔ "نہیں اس کو پہنچا دیجئے"۔

اب جو ہم دیکھتے ہیں تو غسلخانہ میں اندر سے زنجیر لگی ہوئی ہے، ہم نے ٹائیگر کو باہر پہنچا کر چوکیدار کے سپرد کر دیا اور فوراً اندر آ کر کہا۔

"ٹائیگر باہر گیا اب آپ نکلئے"۔

بیگم بالکل ٹائیگر کی طرح ہانپتی ہوئی غسلخانہ سے اس طرح برآمد ہوئیں کہ نہ پیر میں جوتا، نہ سر پر دوپٹہ۔ ہم نے کہا "آخر یہ بھی کوئی وحشت ہے چوکیدار کو بلوا کر ٹائیگر کو باہر بھجوا دیا ہوتا۔"

کہنے لگیں "جی ہاں باہر بھجوا دیا ہوتا، وہ موا ایک دم سے سر پر آ گیا میں بیٹھی ہوئی میز پوشں کی جھالر بن رہی تھی کہ اس موئے کے ہانپنے کی آواز آئی اب جو منہ اٹھا کر دیکھتی ہوں تو وہ بالکل سر پر کھڑا ہوا تھا، میرا تو دم ہی نکل گیا، آپ آج ہی اس کو گھر سے نکال لیے نہیں تو کسی دن مر جاؤں گی"۔

ہم نے بھی جب سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ صورت نبھنے والی نہیں ہے، چنانچہ اب ٹائیگر تو ہمارے دوست مسٹر اسکاٹ کے یہاں ہے جن کی بیوی کو اس سے اس قدر محبت ہے کہ شاید مسٹر اسکاٹ سے بھی نہ ہوگی اور ہمارے گھر میں بھی امن ہے بلکہ ہم میاں بیوی کے تعلقات اب پہلے سے زیادہ خوشگوار ہیں، معلوم ہوا کہ ٹائیگر ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج کی حیثیت رکھتا تھا۔

عمدۃ الحکماء

کریم کو آپ نہیں جانتے نہ جان سکتے ہیں۔ ہم سے پوچھئے بلکہ ہمارے دل سے پوچھئے کہ یہ حضرت ہیں کیا چیز۔ دنیا میں بہت سے ذہین دیکھے ہیں ایک سے ایک چلتے ہوئے بقراطوں سے پالا پڑا ہے۔ مگر یہ شخص تو بلا ہے بلا۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں پڑھا۔ انگریزی اخبار دے دیجئے تو الٹا اور سیدھا نہ سمجھ سکیں۔ مگر دو سال تک کلب کا ممبر رہا۔ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہن کر آتا تھا اور برج کھیلتے ہوئے "نو بٹ" اور "نو ٹرمپس" کہنے کے علاوہ کمال یہ تھا کہ لوگ اس سے گھنٹوں انگریزی میں باتیں کرتے تھے اور وہ "یس" اور

"تو" ایسے ایسے مقامات پر کہتا تھا کہ کبھی جو غلطی کرے۔ مدتوں لوگ اس کو گریجویٹ سمجھا کرتے تھے اور جب لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرت انگریزی کے آس پاس بھی نہیں گذرے تو بیقین مشکل سے آتا تھا۔ اُردو اور فارسی بھی واجبی ہی سی جانتے تھے مگر شعرا کی محفل میں اس ٹھاٹھ سے داد دیتے تھے گویا سند عطا کر رہے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں بیٹھ کر ادبی مباحث پر ایسی رائے زنی فرماتے تھے گویا اگر آپ رائے نہ دیتے تو یہ مبحث تشنہ رہ جاتا۔ پیشہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا مگر مصروفیت بے حد تھی اور یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اور اچھے سے اچھا پہنتے ہیں۔ اعلے سے اعلے سوسائٹی میں پہنچ تھی۔ ہر دفتر میں ایک آدھ دوست پال رکھا تھا اور ہر محکمہ میں آپ کے واقف کار موجود تھے۔ خیر یہاں تک تو غنیمت تھا مگر یکایک آپ غائب ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ "صاحب ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں ہے۔ حسنِ ظن سے کام لیجیے تو جن اور سچ پوچھیے تو بھوت تھا۔ کسی نے کہا مقروض ہو گیا تھا اپنی شان کے پیچھے خودکشی کر لی ہوگی۔ عام رائے یہ تھی کہ لڑائی پر چلا گیا اور انیس کا خیال یہ تھا کہ سزا ہو گئی۔

دو سال کے بعد لاہور میں ایک دن انیس نہایت بدحواسی کے ساتھ

ہنستا ہُوا گھر واپس آیا۔ انیس مجھ سے ملنے لاہور آیا ہوا تھا۔ مگر میں نے اپنے ہی محکمہ میں انیس کے لئے بھی ایک جگہ نکلوا کر اس کو اپنے ہی ساتھ رکھ لیا تھا۔ خیر یہ تو ایک غیر متعلق سی بات تھی۔ اس وقت تو میں انیس کی ہنسی سے پریشان تھا کہ آخر یہ کس دیوارِ قہقہہ سے آیا ہے کہ ہنسی کسی طرح دم ہی نہیں لینے دیتی۔ آخر میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "آخر بات تو بتاؤ یا خواہ مخواہ کی بد مذاقی کر رہے ہو۔"

انیس نے ہنستے ہُوئے کہا۔ "عمدۃ الحکماء" اور پھر وہی پیٹ پکڑ پکڑ کر قہقہے بمشکل تمام آدھ گھنٹے کے بعد معلوم ہُوا کہ کریم زندہ ہیں۔ جیل میں نہیں بلکہ لاہور میں عمدۃ الحکماء بنے ہوئے ہیں اور مطب فرماتے ہیں۔ مطب خوب چل رہا ہے اور اچھی خاصی آمدنی ہے۔

میں نے کہا۔ "مگر سوال تو یہ ہے کہ یہ حکیم بنا کیسے۔"

انیس نے کہا۔ "کہتا ہے باقاعدہ طب پڑھی ہے۔ امتحان دیا ہے۔ سند لایا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مگر بھائی طب پڑھنے کے لئے بھی تو آخر کچھ نہ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کا آخر کیا انتظام ہوا ہوگا۔

انہوں نے کہا "اب یہ تم خود اس سے پوچھنا۔ اے صاحب وہ تو بڑے رعب و داب سے مطب کرتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی بیٹھک میں نہایت شاندار فرش پر مسند اور گاؤ تکیہ لگا کر پیچوان لئے بیٹھا تھا۔ شاگرد نسخے لکھ رہے تھے اور مریضوں کا وہ ہجوم تھا کہ میں کیا کہوں۔ مجھ سے نہایت تپاک سے ملے اور آج رات مجھے اور تم کو کھانے پر بلایا ہے۔"

شام کو انہوں نے ایک شاندار مکان کے قریب لے جا کر کہا "پڑھئے سائن بورڈ" مطب عمدۃ الحکما حکیم مولوی محمد عبد الکریم صاحب نبیرۂ حکیم الحکما الحاج حکیم مولوی عبد الغفور صاحب مرحوم طبیب شاہی دربار مہاراجہ صاحب بہادر کچھ ریج" اس عظیم الشان بورڈ کو پڑھ کر بہت سے تندرست بیمار ہو چکے ہوں گے۔ مگر ہم کو کریم نے یعنی عمدۃ الحکما بلکہ نبیرۂ حکیم الحکما نے بیمار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور عین اسی وقت جب کہ ہم سائن بورڈ پڑھنے میں مصروف تھے۔ حکیم صاحب کی مرعوب کر دینے والی لینڈو پھاٹک پر آ کر رکی۔ حکیم صاحب غالباً مریضوں کو دیکھنے تشریف لے گئے تھے ہم لوگوں کو دیکھ کر نہایت خلوص سے معانقہ فرماتے ہوئے کہا بھئی یہ کیا ستم ہے کہ ع

ہزاروں قرابتوں پہ یوں مرا مہجور ہو جانا

سوال یہ ہے کہ آخر تم کب سے لاہور میں ہو؟"

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے حکیم صاحب کے ایوان تک پہنچ گئے۔ اس عرصہ میں ان کو لاہور آنے کی وجہ، مدتِ قیام اور اسی قسم کی حدود اربعہ نما باتیں بتا دیں۔ حکیم صاحب نے ہم کو بٹھاتے اور خود بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شادی بھی کی تم نے مسخرے آدمی یا اب تک واحد حاضر ہو؟"

الہام اس کو کہتے ہیں کہ فوراً ایک بات سوجھ گئی۔ عرض کیا۔ "جی ہاں۔ شادی کیا کی ہے ایک مصیبت مول لے لی ہے۔ جب سے نیک بخت آئی ہے ایک دن تو تندرست رہی نہیں۔"

انیس نے گھور کر ہم کو دیکھا مگر ہمارے اشارے پر وہ خاموش رہا۔ حکیم صاحب نے توجہ سے پوچھا۔ "کیا علالت کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "کیا کہوں کریم بھائی دنیا بھر کے علاج کر ڈالے مگر مرض کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اب تو گویا گھر ہی کا حکیم ہے تم خود دیکھ لینا۔"

آمادگی سے فرمایا۔ "جب کہو آجاؤں یا جب چاہو لے آؤ۔"

ہم نے وعدہ کر لیا کہ "کل ہی لائیں گے۔ آخر علاج میں بلا وجہ دیر کیوں ہو۔"

حکیم صاحب کے یہاں سے پُر تکلف مقویات تناول کر کے جب وقت ہم دونوں واپس ہوئے۔ انیس نے حکیم صاحب سے رخصت ہوتے ہی بے صبری کے ساتھ پوچھا۔ "آخر یہ حرکت کیا تھی یعنی خواہ مخواہ ایک بیوی بھی تصنیف کر لی اور تی الید یہ اس تو تصنیف بیوی کی علالت بھی۔"

ہم نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

انیس نے کہا۔ "مثلاً۔"

ہم نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ بہت بننے لگا ہے یہ' اور قسم لے لو مجھ سے جو طب کی دُم کا بھی اس کو پتہ ہو۔ کل لاؤں گا میں اپنی بیوی کو اور مستقل طور پر ہو گا ان حضرت کا علاج کچھ دن یہی تماشہ سہی۔"

انیس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ ٹھیک ہے مگر بیوی کا انتظام کہاں سے کرو گے۔"

ہم نے کہا۔ "ارے بھائی سخت کودن ہو یعنی تم جو موجود ہو۔"

چلتے چلتے ٹھہر کر بولا۔ "کیا مطلب۔"

ہم نے کہا۔ مطلب یہ کہ کل تم کو پردہ دار تانگہ پر لاؤں گا۔ پردہ کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ تمہاری نبض دیکھیں گے۔ حال سنیں گے، نسخہ لکھیں گے۔ پھر

مستقل طور پر علاج ہوتا رہے گا۔ کبھی تم مجھ کو لے آنا کبھی میں تم کو لے آیا کروں گا جب تم لاؤ گے مجھے تو کہہ دینا میرے متعلق کہ کام پر گیا ہوا ہوں اور تم گویا اپنی بھابی کو لے آئے ہو ورنہ میں خود تم کو لے آیا کروں گا۔"

انیس نے اُچھل کر کہا "سخت لفنگے ہو تم۔ مگر تمہاری قسم رہے گا لطف"

دوسرے دن انیس کو پردہ دار تانگہ میں لے کر جب ہم عمدۃ الحکماء کے مطب میں پہنچے ہیں تو واقعی عقل کے مریضوں کا کافی ہجوم تھا جو اس جاہل مطلق کو طبیب حاذق سمجھ کر مرنے کے لئے یہاں جمع تھے۔ حکیم صاحب نے ہم کو دیکھتے ہی اپنے دوسرے مریضوں کو چھوڑا اور خود اُٹھ کر تانگے کے قریب آ گئے ہم نے عرض کیا :-

"میں مختصراً حال بیان کر دوں پہلے"

ڈانٹ کر بولے "نہایت بدتمیز ہیں آپ۔ ٹھہریئے۔ آداب عرض بھابی۔"

ہم نے پردہ کے اندر منہ ڈال کر دیکھا تو انیس کا ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا "تم خود کیوں نہیں کہتی ہو۔ اچھا۔ اچھا۔ خیر بھئی وہ بھی سلام کہہ رہی ہیں۔"

حکیم صاحب نے فرمایا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب بیان کیجئے حال"۔

ہم نے کہا "بھئی ان کی علالت کا سلسلہ ایک سال سے چل رہا ہے"۔

حکیم صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ بیان کرتے رہئے میں نبض دیکھوں گا ذرا"۔ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے پردہ میں ہاتھ ڈال دیا اور انیس نے نبض دکھانے کے لئے ہاتھ دے دیا۔ ہم نے بیان کرنا شروع کیا۔

"پہلے تو ان کو صرف نزلہ تھا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے دورے پڑنے لگے"۔

حکیم صاحب نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا — اچھا — پھر"۔

ہم نے کہا "۔ انسائیکلوپیڈیا کے دوروں نے ان کو بہت کمزور کر دیا"۔

حکیم صاحب نے کہا۔ "وہ تو ہوتا ہی ہے۔ پھر"۔

ہم نے کہا "۔ ان دوروں کا علاج حکیم محمد امین صاحب نے کیا۔ دورے تو جاتے رہے مگر وٹامن ڈی کی شکایت ہو گئی"۔

حکیم صاحب نے تشویش سے کہا "ارے۔ رے۔ رے حکیم امین صاحب کو پہلے سے روک تھام کرنا تھی"۔

پردہ کے اندر سے آواز آئی۔ "کھوں کھوں کھوں۔ کھی کھی کھی"۔

ہم نے برجستہ کہا۔ "اب آج کل یہ حال ہے۔ کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹرانسمٹر ہو جاتا ہے"۔

حکیم صاحب نے کہا۔ "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ تشنجی کیفیت بھی ہے اور نبض کی رفتار بھی بہت تیز ہے"۔

ہم نے کہا۔ "یہاں لاہور میں ڈاکٹر ممتاز صاحب کا علاج تھا۔ ان کا خیال ہے کہ پرانی قسم کا کانسٹیننٹی نوپل ہے"۔

ذہانت دیکھیے کہ کانسٹنٹی نوپل پر کانسٹی پیشن کا شبہ کر کے کہا۔ "قبض کی شکایت بھی ہے"۔

ہم نے کہا۔ "جی ہاں نہایت سخت اور اختناق الرحم کی مریضہ بھی رہ چکی ہیں۔ پھر یہ کہ بچپن میں ایک مرتبہ ولاڈی واسٹک کا شدید حملہ ہوا تھا"۔

حکیم صاحب نے غور سے سنتے ہوئے کہا۔ "کچھ حالات مجھ کو دائی سے بھی پوچھنا ہوں گے"۔

ہم نے کہا۔ "میں نے ان کو لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا وہ کہتی ہے کہ یہ سب فزکس کی خرابی ہے"۔

حکیم صاحب نے کہا۔ "یکی نہ ہے اس کا تو کہیں پتہ بھی نہیں ان کیلئے نسخہ

لکھتا ہوں انشا اللہ ایک ہفتے میں دیکھئے گا کتنا فرق ہوتا ہے بڑے بڑے ناموں کی جو بیماریاں آپ کو اور ان کو بتا دی گئی ہیں ان کا کم از کم اب کوئی اثر نہیں ہے اگر ان کو مقوی بدن اور مولدِ خون ادویہ دی جائیں تو آنتوں کا جگر کا اور گردوں کا طبعی وظیفہ اعتدال پر آ جائے گا۔ دراصل ان کے لئے تحفّظِ قوی کی اشد ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا۔ "اور حکیم صاحب رڈیارڈ کپلنگ"؟

کہنے لگے "نہیں صاحب وہ نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ آیئے میں نسخہ دیتا ہوں"

حکیم صاحب سے جب وقت نسخہ لے کر ہم لوٹتے ہیں۔ انیس کی حالت غیر تھی۔ سانس اکھڑ چکی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہاتھ پاؤں تخ ہو رہے تھے۔ بشکل تمام جب اس کی حالت قابلِ اطمینان ہوئی تو اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا

"میں اس مذاق میں مر جاؤں گا۔ ناممکن ہے ضبط کرنا۔"

ہم نے کہا۔ "اب کل یہ کرنا کہ میں تانگہ میں رہوں گا اور تم حکیم صاحب سے حال کہنا۔"

انیس نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ نا بابا مجھ سے ضبط نہ ہو سکے گا فوراً ہنسی آ جائیگی۔ یہ کمبخت تو جیسا کلب کا ممبر اور جیسا برج کا کھلاڑی تھا۔

ویسا ہی حکیم بھی ہے۔"

ہم نے کہا۔"مگر دیکھتے ہو کہ کسی جگہ اپنی نااہلی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔"

انیس نے کہا۔"مگر ایک بات ہے کہ اب اس کو کچھ طبی باتیں کرنا آگئی ہیں مثلاً مقوی بدن، مولد خون، جگر اور گردوں کا طبعی وظیفہ، تحفظ قویٰ۔ اس نے طب پڑھی ضرور ہے۔"

ہم نے وثوق سے کہا۔"احمق ہیں آپ میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ یہ تمام معلومات دواخانوں کے اشتہارات سے حاصل کی ہیں۔ آخر نوبٹا دو تو ترمیں بھی تو کہتا تھا۔"

انیس نے کہا۔"مگر اس مذاق کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

ہم نے کہا۔"بڑا نتیجہ خیز مذاق ہے جناب کم سے کم اس کو یہ تو معلوم ہی ہو جائیگا کہ ہم لوگ اتنے گدھے نہیں ہیں جس قدر صورت سے نظر آتے ہیں اُس کو صرف یہ بتادینا ہی کافی ہے کہ اور کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔"

دوسرے دن ہم تو تانگے میں رہے اور انیس نے حکیم صاحب سے گویا اپنی بھابی کا حال کہہ دیا کہ دائی نے دیکھ کر کیا بتایا ہے اور کل دوا پینے کے بعد ان کی کیا کیفیت رہی۔ حکیم صاحب نے تانگہ کے پاس آکر ہماری نبض دیکھی انیس حال بیان کر رہا تھا "دائی کا خیال یہ ہے کہ رحم میں کچھ انٹر نیشنل کیفیت ہے۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "یہ۔ یہ اسی کا خیال تھا مگر آج نبض کی حالت بہتر ہے۔"
انیس کمبخت نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مارے ہنسی کے قلابازی کھا گیا اور حکیم صاحب
حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر خود ہم کو حکیم صاحب کی حیرت دُور کرنے کیلئے باہر آنا
پڑا۔ حکیم صاحب نے اور بھی بھونچکا ہو کر پوچھا۔ "یہ یعنی یہ کیا حرکت تھی؟"
دیر تک ہنسنے کے بعد ہم نے کہا۔ "صرف تم کو یہ بتانا تھا کہ تم کم سے کم ہم سے
نہ بنو۔ تمہاری اس طبابت کے ڈھونگ کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔"
انیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر کمال ہے کریم کہ ایسا باقاعدہ حکیم بنا بیٹھا ہے"
حکیم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ تو میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ نبض تو ہے
مردانہ اور بیماریاں جتنی بتائی ہیں وہ سب زنانہ ہیں آخر یہ ماجرا کیا ہے۔"
انیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے قتل کر ڈالو بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دو مگر
کیا مجال ہے کہ اپنے بہروپ کو کبھی بھی تسلیم کرے۔"
حکیم صاحب نے کہا۔ "مگر لاحول ولاقوۃ ایسا خطرناک مذاق کرتے ہو۔ اچھا میں بھی سمجھونگا تم سے
سمجھنے تو خیر وہ کیا مگر دنیا کو اپنا حکیم ہونا سمجھا خوب کئے ہیں مطب میں
ہجوم بڑھتا ہی جاتا ہے اور روپیہ کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ حکیم صاحب
سے پوچھنا یہ ہے کہ گدھے کے لئے خشکہ مفید ہوتا ہے یا مُضر۔"

اُن کی ضرورت ہے

اخبارات میں "ضرورت ہے" والے کالم پڑھنے کی خدا نہ کرے آپ کو کبھی ضرورت پیش آئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر بلا ضرورت ان کالموں کی سیر کی جائے تو شاید سارے اخبار میں اس سے زیادہ دلچسپ اور کوئی حصّہ ہوتا ہی نہیں۔ آپ کے وہم و گمان میں بھی وہ ضرورتیں نہیں آسکتیں جن کا اظہار نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان کالموں میں ہوتا ہے۔ یہ اشتہار عموماً کچھ اس قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

ضرورت ہے ایک شریف خاندان حسین تعلیمیافتہ۔ انیس سالہ مسلمان لڑکی کے لئے ایسے بر کی جو شریف خاندان، برسر روزگار، یا صاحب جائداد ہو گویا بدصورت

اور قبر میں پیر لٹکائے ہوئے بزرگ بر کو ترجیح دی جائیگی"۔ ضرورت ہے ایک ایسی آیا کی جو دو بچّوں کی بیک وقت نگہداشت کر سکے اور دونوں کو شکایت کا موقع نہ دے"۔ "ضرورت ہے ایک ایسے گھوڑے کی جو کم خوراک ہو سلیم الطبع ہو۔ دُم کم اور گھوڑا زیادہ ہو۔ اخلاقی حالت اچھّی ہو۔ تانگہ اور ران سواری کے علاوہ گھوڑ دوڑ میں بھی مفید ثابت ہو اور بغیر سائیس کے اپنی نگرانی خود کر سکتا ہو"۔ "ضرورت ہے ایک ایسے ٹیوٹر کی جو ایک درجن بچّوں کو کم سے کم تنخواہ پر پڑھا لکھا کر جلد سے جلد فاضل کر دے تنخواہ طلب نہ کرنے والے امیدواروں کے ساتھ خاص رعایت کی جائیگی"۔ "ضرورت ہے سویاں بنانے کی ایک ایسی مشین کی جو بائیسکل کا کام بھی دیتی ہو اور ٹائپ رائٹر بھی ثابت ہو"۔ "ضرورت ہے ایک ایسے موٹر کار کی جو پٹرول کے کوپن بھی مہیا کرتا رہے یا کبھی کبھی بغیر پٹرول کے بھی چل لیتا ہو"۔ "ضرورت ہے ایک مفت خورے کے لئے ایک ایسی کنیا کی جو سُندر ہو۔ دھنوان ہو اور جس کے ماتا پتا لڑکے کو ولایت بھیج سکیں تاکہ وہ لڑکی کے لئے ایک سوت والیس ہی لیتا آئے"۔

مختصر یہ کہ اس قسم کی ضرورتیں تو خیر ہوا ہی کرتی تھیں آج ایک اور ضرورت لاحق ہو رہی ہے ریڈیو کے لئے لیکھ کی اور ضرورت بھی وہ ضرورت

جس کے لئے نہ اشتہار دیا جا سکے نہ جس کو اشتہار میں سمجھایا جا سکے مگر چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے لہٰذا اس ضرورت کے اظہار کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا گیا ہے کہ اسی موضوع کو اسی ریڈیو پر زیرِ بحث لایا جائے اور تفصیل کے ساتھ بتایا جائے کہ یہ ضرورت واقعی کس قدر سنجیدہ ہے۔ ریڈیو کے لئے لکھنے والوں کو ڈھونڈنا جس قدر بظاہر آسان سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی قدر دراصل ٹیڑھی کھیر ہے۔ ریڈیو والوں ہی کا دل خوب جانتا ہے کہ ایک ایک لکھنے والے کے لئے ان کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے تو وہ موضوع ڈھونڈتے ہیں۔ سر جوڑ کر اس موضوع کے تمام نشیب و فراز کو آپس ہی میں سمجھتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ سننے والوں کی دلچسپی کا توازن قائم کیا جاتا ہے اور اس توازن کے معیار پر اس موضوع کو جانچا جاتا ہے اس کے بعد یہ لوگ ریڈیو اسٹیشن ہی پر بیٹھ کر ہر طرف ناک اٹھا اٹھا کر سونگھنا شروع کرتے ہیں کہ اس موضوع پر لکھنے والے کی خوشبو کس سمت سے آ رہی ہے۔ جس طرف بھی کامیابی کے آثار نظر آئے بیچارے دوڑ پڑے اسی طرف۔ مہم یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ موضوع کے مطابق لکھنے والا مل جانا تو گویا ایسا ہے کہ ؎

پہلی منزل ہے فنا اے رہروِ راہِ بقا آگے قسمت ہے تری اور ہمتِ مردانہ ہے

فرض کر لیجئے کہ موضوع ہے کچھ اقتصادی قسم کا اور مل گئے ہیں ایک بہت بڑے ماہر اقتصادیات بزرگ لیکن اب ان کو یہ بتانا کہ ریڈیو کے لئے ایک خاص اسلوب ہوتا ہے جو نہ تحریر ہے نہ تقریر بلکہ ان دونوں کے علاوہ کچھ اور ہی چیز ہے اور بھی کچھ اور چیز سمجھانے میں جو لوہے کے چنے چبانا پڑتے ہیں ان کا اندازہ ریڈیو سٹ پر بیٹھ کر کوئی پروگرام سننے سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایک آدھ مرتبہ ریڈیو پر بولنے یا ریڈیو کے لئے کچھ لکھنے کے بعد تو خیر ریڈیو کی ضروریات کا اندازہ ہر ایک کو آسانی سے ہو جاتا ہے مگر مصیبت تو یہ ہے ریڈیو پروگرام روز کا، ہر روز ایک نیا موضوع اور ہر موضوع پر بولنے والے نئے نئے۔ سننے والے نئی آوازیں سننا چاہتے ہیں۔ ریڈیو والے ان کو نئی آوازیں سنانا چاہتے ہیں اور ہر نئی آواز ایک آدھ مرتبہ کے بعد پرانی ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ریڈیو کی یہ ضرورت جس قدر پوری ہوتی ہے اسی قدر تشنہ بھی رہتی ہے۔ ذرا تصور تو کیجیے کہ روز ایک نیا موضوع۔ روز ایک نیا بولنے والا۔ ادب کی وسعتیں محدود۔ دنیا کی آبادی کم اور آبادی کا ہر فرد کام کا نہیں۔ پھر ایک قصہ اور بھی ہے کہ ریڈیو جو ایک خاص قسم کا لٹریچر پیش کر رہا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابھی ایک انوکھی چیز ہے۔ خاموش

فلموں کو لوگوں نے گونگوں کا خواب کہا تھا مگر یہ ریڈیو کے پروگرام تو اندھوں کا تماشہ بھی نہیں کہے جا سکتے ان کو تو آنکھوں والے بھی کانوں سے سُن کر اپنی سماعت ہی سے دیکھنا بھی چاہتے ہیں۔ ایک کامیاب ریڈیو ڈراما وہی ہے جس کو سُن کر سننے والے ایک سیکنڈ کے لئے بھی آنکھوں کی ضرورت محسوس نہ ہو اور لطفِ نظارہ حاصل ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ جو ڈراما نگار اب تک آنکھوں سے دیکھنے والے ڈرامے لکھتے رہے ہیں ان کے لئے یہ کیونکر آسان ہے کہ وہ کانوں سے دیکھنے والے ڈرامے بھی اسی کامیابی کے ساتھ لکھ لیں جو مقرر اپنی وجاہت۔ اپنے چہرے کے اُتار چڑھاؤ۔ اپنی مسکراہٹوں اور سنجیدگیوں کے سہارے اسٹیج پر تقریریں کرنے کے عادی ہوں وُہ اپنی یہ تمام اسپرٹ اپنے لب و لہجہ ہی تک کیونکر محدود رکھ سکتے ہیں۔ ایک ڈرامہ میں خواہ وُہ اسٹیج کا ہو یا فلم کا۔ شانہ کی ذرا سی حرکت یا ہاتھوں کی معمولی سی جنبش یا آنکھوں کے خفیف سے اشارے سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر ریڈیو ڈرامے میں یہ تمام حرکتیں۔ جنبشیں اور اشارے الفاظ کی صورت میں اس طرح لانا پڑتے ہیں کہ سننے والا ان کو دلچسپی کے ساتھ نہ صرف محسوس کرے بلکہ اس کی محویت کو اس کا موقع ہی نہ ملے کہ وہ ریڈیو کی اس مجبوری کو مجبوری بھی سمجھ سکے۔

اسٹیج پر ایک کردار رنگ سے نکل کر سامنے آتا ہے۔ تماشائی دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ سننے کی۔ مگر ریڈیو ڈرامے میں یہ کیونکر ممکن ہے وہاں تو الفاظ اور آواز ہی سے کردار کا تعارف ہوتا ہے۔ آنے والا کہتا ہے:-

"سُنوت کا ہل ہو حامد بعنی ابھی تک بیٹھے ہو"۔

دوسری آواز آتی ہے۔ "محمود صاحب ذرا گھڑی دیکھ لیجیے کہ آپ کتنی دیر میں تشریف لائے ہیں"۔

سننے والوں کو معلوم ہو گیا کہ آنے والا محمود ہے اور صاحب خانہ کا نام حامد۔ اسی طرح ان کی ہر نقل و حرکت آواز ہی کے ذریعہ پیش کی جا سکتی ہے اور پورا ڈراما اپنی دلچسپی کے ساتھ ہی ساتھ ریڈیو کی ان ضروریات کو لے کر چلتا ہے اب سوال یہ ہے کہ ان ضروریات کو سمجھنے والے اور سمجھ کر کامیابی کے ساتھ نباہ لے جانے والے ڈرامہ نگار کہاں سے آئیں۔ ریڈیو بالکل نئی چیز نہ سہی مگر ابھی پرانی چیز بھی نہیں ہے۔ لکھنے والے پیدا ہوتے جا رہے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریڈیو کے ذریعہ پیش ہونے والے لٹریچر کا معیار بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے خیر یہ تو کچھ ٹھوس حقیقتیں تھیں مگر ہمارا تو اس تصور ہی سے

دم اُلجھنے لگتا ہے کہ ہر روز ایک نیا موضوع کہاں تک پیدا ہو سکتا ہے اور ہر روز کے لئے ایک نیا بولنے والا، ایک نیا لکھنے والا اور ایک نیا ادا کرنے والا کہاں سے آتا رہیگا۔ ایک دو دن کی بات ہو تو خیر صبر کر لیا جائے دماغ کو چلایا جائے مگر وہاں تو حال یہ ہے کہ دماغ کو اس شرط پر چلاؤ کہ وہ چلتا ہی رہے۔ ہر جستجو کامیابی کے بعد ختم ہو جاتی ہے مگر یہ ریڈیو والی جستجو تو شیطان کی آنت ہے جس کا ایک سرا ہاتھ آجاتا شرط ہے پھر دوسرا سرا کبھی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ضرورت کا اشتہار دیا جا سکتا ہے۔ بر کو کنیا اور لڑکی کے لئے لڑکا تانگہ کے لئے گھوڑا اور گھوڑے کے لئے تانگہ۔ کرایہ کے لئے مکان اور مکان کے لئے کرایہ۔ طالب علموں کے لئے ٹیوٹر اور ٹیوٹر کے لئے طالب علم مختصر یہ کہ اشتہار کے ذریعہ ہر لازم کے لئے ملزوم اور ملزوم کے لئے لازم کا ملنا ممکن ہے مگر ریڈیو کی یہ ضرورت اخبارات کے ضرورت ہے والے کالموں میں بھی نہیں سما سکتی۔ یہ ضرورت ہے تو یقیناً ضرورت ہی اور اشد قسم کی ضرورتوں میں سے ایک ہے مگر نہ یہ کبھی پوری ہوتی ہے نہ پوری ہو سکتی ہے۔ یہ تو اس قسم کی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے کہ راجہ کے غلّے کے گودام میں لاکھوں من غلّہ تھا چڑیاں اُس میں جاتی تھیں اور ایک ایک دانہ لے کر پھر سے اُڑ جاتی تھیں۔ اس کے

بعد قیامت تک پھر کہتے رہئے جواب یہی ملیگا کہ پھر شدہ غلہ کا گودام ختم ہو سکتا ہے نہ یہ کہانی۔ ریڈیو کی یہ ضرورت بھی اسی قسم کی ہر دم تازہ ضرورت ہے۔ جتنی جتنی پوری ہوتی جاتی ہے۔ اتنی ہی اتنی لاحق ہوتی رہتی ہے۔ ہر روز خدا اپنے خزانۂ غیب سے ایک نیا موضوع عطا کرتا ہے اس موضوع پر بولنے والا اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے مگر جب دیکھئے یہ ریڈیو والے اسی فکر اور اسی تلاش میں اسی ضرورت کے ماتحت سرگرداں رہتے ہیں کہ دیکھو کہاں سے آتے۔ رفتہ رفتہ ان کی متجسس نگاہیں اور ان کے چہروں کی ساخت ضرورت ہے والا کالم بن چکی ہے جس سے ہر شخص پڑھ سکتا کہ ضرورت ہے ایک لکھنے کی

اختلاج

خدا اپنے ہر بندے کو دولتِ اختلاج قلب سے مالامال کر دے۔ ع.

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

بات یہ ہے کہ جناب یہ خاکسار کوئی خود غرض تو ہے نہیں کہ ایک نعمتِ عظمیٰ کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرالے اور اپنے علاوہ دنیا میں کسی اور کو اختلاجِ قلب کے مرض میں مبتلا ہی نہ ہونے دے، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام احباب و اعزہ کو، ہمارے تمام ہمدردوں اور غمگساروں کو اور ہر دوست اور دشمن کو اگر خدا کسی مرض میں مبتلا کرے تو وہ مرض اختلاج اور صرف اختلاج ہو۔ بلکہ اگر کسی

شخص کی قسمت میں کوئی بھی مرض نہ لکھا گیا ہو صرف تندرستی ہی لکھی ہوئی ہو تو بھی اس کو خداوند عالم اپنے خزانہ غیب سے اختلاج قلب عطا کرے ہم اختلاج کے پرانے مریض ہیں اتنے پر لے کر ۶۰۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

اور اسی مرض کی بدولت دنیا کے جو لطف ہم نے اٹھائے ہیں ان کو یا تو ہم جانتے ہیں یا دوسرے اہل اختلاج جانتے ہونگے۔ بہتر سے بہتر غذا کھائیے ایک سے ایک لاجواب پھل اپنی تمام شادابیاں لئے ہوئے دست بستہ پلیٹ کے اندر رکھا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ انگور، انار، سیب، سنگترا، سردا مختصر یہ کہ جملہ انواع و اقسام کے شاداب و شیریں، مفرح اور لذیذ پھل ہونگے۔ خوشبودار تر تراتا ہوا گاجر کا حلوا جس میں بارہ کا میوہ ہوگا اور اوپر سے چاندی کے ورق خوشبو ایسی کہ معدہ اپنا منہ کھول دے۔ سیب کا مربّہ اور " ورق نقرہ پیچیدہ بجوز ند " اعلےٰ درجہ کے ٹھنڈے، خوشبودار اور میٹھے شربت، پھر ہر ایک پر حکومت کیجئے دفتر سے چھٹی لے کر چارپائی پر پڑے رہئے۔ کہنا تو یا کہ اختلاج قلب کا مرض پیدا کیجئے اور دنیا میں جنت کا لطف حاصل کیجئے۔ زندگی کو زندگی بنائیے اور جنت سے جدا رہ کر جنت میں داخل ہو جائیے۔ یہ ہمارا ذمہ کہ اگر ایک مرتبہ بھی اختلاج

کی چاٹ آپ کو لگ گئی تو پھر آپ ہی یہ دعا کریں گے کہ خدا کرے اس مرض میں افاقہ نہ ہو ع

قرار ہو نہ دلِ بے قرار کو یا رب

ہماری زندگی اور کسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی عبرت انگیز کیوں نہ ہو مگر اس حیثیت سے یقیناً قابلِ رشک ہے کہ ہم بفضلہٖ اختلاج کے مریض ہیں اور اپنے اس مرض کو ہم نے اس قدر تخویف آمیز بنا رکھا ہے کہ ہمارے لئے ہر ایک دست بدعا رہتا ہے کہ خدا ہم کو شفائے کامل عطا فرمائے مگر یہ دعا اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ خود ہم ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں کہ جیتے جی اس مرض سے خدا ہم کو محروم نہ رکھے۔

شادی سے قبل اور تعلیمی زمانہ میں تو خیر اس مرض سے اتنا ہی فائدہ ہوتا تھا کہ اسکول سے چھٹی مل جاتی تھی اور گھر پر پھل وغیرہ سے ہماری ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ مگر شادی کے بعد تو یہ پتہ چلا کہ اگر کسی فرمانبردار بیوی کے شوہر کو خدا نے اختلاج کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور اس اختلاجی شوہر میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ شاہی کر سکتا ہے گھر بیٹھے اور اپنا ایسا رعب قائم کر سکتا ہے کہ مسولینی بھی دیکھے تو ششدر رہ جائے۔ ہوتا یہ ہے کہ دفتر سے آئے ہیں اور اختلاجِ قلب کی رعایت سے فواکہات سے ناشتہ کرنے کے بعد گاجر کے حلوے سے شغل فرما رہے ہیں کہ بیگم صاحبہ نے سالِ رواں کا بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ خرچ بڑھتا ہی جاتا ہے اور آمدنی کی کوئی

صورت پیدا نہیں ہوتی۔ وہی مقرّرہ تنخواہ ہے اور خرچ کی غیر محدود مدیں۔ بیماریاں ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ دوا فروش کا مطالبہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لائف انشورنس کمپنی والے صبر کر کے بیٹھ رہے ہیں اور پالیسی ختم ہو گئی ہے۔ بچّوں کے اسکول کی فیس الگ کھائے جاتی ہے اور اب اللہ رکھّے پاس ہوئے ہیں تو نئی کتابوں کی فکر ہے۔ نوکروں کی تنخواہ کا قصّہ یہ ہے کہ ——

ہم نے بات کاٹ کر کہا:۔

بیگم یہ تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں تم جانتی ہو کہ میں مریض ہوں۔ اپنی زندگی سے عاجز۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہل کے پانی نہ پیتا۔

بیگم نے عاجزی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں اور کس سے کہوں۔ اب یہ دیکھئے کہ اسلم میاں کے یہاں آج ہی کل میں ولادت ہونے والی ہے مجھ کو چاہیئے تو یہ کہ ماں باپ اور بچّے کو جوڑے دوں اور ۔۔۔۔۔۔"

ہم نے الجھ کر کہا "میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں اور آپ کو جوڑے دینے کی پڑی ہے اُف —— اُف —— اُفوہ!

ہم نے بدحواس ہو کر ٹہلنا شروع کر دیا اور بیگم بیٹھے بیٹھے بدحواس ہو گئیں۔

ہم کو مصلحتاً اختلاج شروع ہوا۔ ان کا دل پیچ پیچ دھڑکنے لگا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے چارپائی پر بیٹھے اور قمیص کے بٹن کھول کر وحشت ناک صورت بنا کر لیٹ گئے۔ انہوں نے خود پنکھا جھلنا شروع کیا اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ فوراً برف ملا کر بید مشک کا شربت تیار کرے۔ ملازمہ نے گھر بھر میں یہ خبر کر دی کہ میاں کو اختلاج کا دورہ ہوا ہے اور گھر کا ہر چھوٹا بڑا ہماری خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کوئی شربت پلا رہا ہے۔ کوئی پنکھا جھل رہا ہے۔ کوئی برف توڑ توڑ کر کھلاتا ہے اور زیادہ تر لوگ بیگم کا ناطقہ بند کئے ہوئے ہیں کہ آخر ہوا کیا تھا اور وہ بیچاری ہیں کہ چپ رسی بن کر رہ گئی ہیں ہر ایک ان ہی کو قصوروار سمجھ رہا ہے کہ آخر تم نے ان سے ایسی فکر پیدا کرنے والی باتیں کیں ہی کیوں؟ وہ غریب ہر ایک کو سمجھا رہی ہیں اور کانا پھوسی ہو رہی ہے کسی کے ہاتھ میں انار ہے۔ تو کوئی سیب لئے کھڑا ہے کسی کو خس کا عطر سنگھانے کی سوجھی ہے۔ تو کوئی سر سہلا رہا ہے پنکھا ہے کہ برابر جھلا جا رہا ہے۔ برف ہے کہ برابر کھلائی جا رہی ہے۔ شربت ہے کہ جتنا چاہیں ہم پئیں۔ یہاں تک کہ ہم کو سکون ہوا اور ہم آنکھیں بند کر کے چپکے لیٹ رہے ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ دن بھر کے تھکے ہوئے دفتر سے آئے ہیں ذرا دیر پنکھا جھلوا کر سو رہیں اور ہمارے تیمارداروں کی بھی یہی مرضی تھی کہ ہم کو نیند آ جائے۔ لہذا ان عشرتوں کے ساتھ ہم سو گئے اور گھر بھر میں ہماری نیند کے اہتمام کے لئے سناٹا کر دیا

گویا کوئی زور سے نہ بولے۔ کوئی ایڑی سے نہ چلے۔ سب پنجوں کے بل چلیں کسی برتن کو زور سے نہ رکھا جائے۔ کوئی دروازہ ہوا سے آواز کے ساتھ بند نہ ہو اور کوئی مکھی ہم پر نہ بیٹھے۔ مختصر یہ کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ ہماری نیند اچاٹ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی نیند کسی کو میسر نہیں آسکتی تھی ہم سوتے اور جی بھر کر آرام کی نیند سوئے۔ اب جو دو گھنٹے کے بعد سو کر اٹھے تو بیگم کا طرزِ عمل ہی دوسرا تھا۔ یا تو وہ اقتصادی مرثیہ پڑھ رہی تھیں یا ہم کو بیدار دیکھتے ہی نہایت شفقت سے بولیں :۔

"سو چکے آپ"؟

ہم نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "جی ہاں کیا بہت دیر سویا"؟

بیگم نے کہا "نہیں تو کوئی دو گھنٹے سوئے ہونگے آپ۔ اچھا اب کچھ کھائیے گا"؟

ہم نے تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا "کچھ دل نہیں چاہتا"۔

بیگم نے کہا۔ ایک آدھ سیب یا سنگترہ۔ یا یہ دیکھئے میں نے آپ کیلئے چکوترے کے کچاؤ بنائے ہیں۔ انگور بھی رکھے ہیں"۔

ہم نے کہا۔ "پیاس معلوم ہو رہی ہے"۔

بیگم نے مدارات سے کام لیتے ہوئے کہا "تو پھر آپ شربت پیجیے۔ بتائیے نارنج کا شربت بناؤں یا صندل کا۔ یا کوئی بوتل کھلوا دوں"۔

ہم نے کہا۔ "خالی پانی پلوا دیجیے۔ شربت کون پیے"
بیگم نے کہا۔ "اچھا تو پھر آپ لمنیڈ کی بوتل پی لیجیے۔"
ہم نے کہا۔ "لائیے تو پھر وہی سہی"

لمنیڈ کی بوتل پی کر چلو ترسے کے کچالو کھائے اور اب گھر کا ہر شخص فرداً فرداً خیریت مزاج پوچھنے کے لئے آنے لگا۔ کسی نے تاش کھیلنے کا مشورہ دیا تاکہ دل بہلے تو کسی نے یہ رائے دی کہ ہم دفتر سے ایک آدھ روز کی چھٹی لے لیں۔ کسی نے تفریح کے لئے جانے کو کہا۔ تو کسی نے کوئی ہنسی کا قصہ سنا کر درباداری کے فرائض کو انجام دیا۔ کوئی گراموفون لے کر بیٹھ گیا اور کسی نے حبش اور اٹلی کی جنگ چھیڑ دی مختصر یہ کہ رات کو اس وقت ہمارا یہ دربار لگا رہا جب تک کہ سونے کا وقت نہیں آ گیا اور آخر ہم اسی شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بادشاہوں کی نیند سو گئے۔

اب چونکہ ہم کو اختلاج کا دورہ ہو چکا تھا لہذا ہمارے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دفتر سے تین روز کی رخصت حاصل کر لی جائے۔ بتایئے کہ کیا بُرے رہے ہم اس طرح۔ پھر گھر پر یہ حال کہ اب چاہے کوئی مر بھی جائے مگر ہم کو اس کا غم اُٹھانے کی زحمت کوئی نہیں دے سکتا۔ عزیز و اقربا کی اموات، بچوں کی بیماریاں، خاندانی حادثات اور بیرونی سانحات کی اطلاع بھی ہم کو نہیں ہو سکتی

بلکہ وُہ زبردست سنسر بیٹھتا ہے کہ مثلاً صاحبزادے صاحب نے تپنگ کے عشق میں کوٹھے کے اُوپر سے پھاند کر اقدام خودکشی کیا اور گھر بھر اس حادثہ کے ماتحت بدحواس ہوگیا۔ خود بیگم کی حالت پاگلوں کی سی ہوگئی اور گھر سے لے کر باہر تک ایک کہرام مچ گیا۔ ان حضرت کی مرہم پٹی ہوتی۔ غرضکہ سب کچھ ہوگیا مگر ہم کو اس کی خبر اس لئے نہیں ہوسکتی کہ مبادا اختلاج کے ماتحت ہمارا دم نکل جائے اور صاحبزادے صاحب کا حادثہ ہمارے لئے موت کا پیغام بن جائے۔ لیکن اگر انتہائی احتیاط کے باوجود ہم کو اس حادثہ کے متعلق کچھ علم ہوجاتے اور ہم اس کے متعلق بیگم سے تصدیق کریں تو وہ اپنے وحشت ناک چہرہ کو زبردستی بشاش بناکر اپنے اضطراب کو اطمینان کے بہروپ میں چھپا کے اپنی رونی صورت کو تبسم زار بناکر یہ کہیں گی کہ:۔

"کچھ بھی نہیں۔ وُہ چبوترے پر سے گر پڑا اور ذرا سا ماتھا چھل گیا ہے۔"

سنسر اس کو کہتے ہیں کہ کوٹھے کا چبوترا بنادیا اور سر پھٹ جانے کو ماتھے کا چھلنا ظاہر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس اطلاع کے بعد ہم کو اختلاج میں مُبتلا ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ ہم کو اختلاج کا مرض نہ ہوتا تو یقین جانیئے کہ اسی کوٹھے کو جو چبوترا ظاہر کیا گیا ہے یہی بیگم

مونٹ ایورسٹ ثابت کرتیں اور یہی سر کا پھٹنا جو ماتھے کا پھلنا بتایا گیا ہے سر کے دو حصّوں میں مساوی طور پر تقسیم ہو جانا کہا جاتا اور پھر ہم اس اطمینان کے ساتھ چارپائی پر لیٹ کر انگور نہ کھا رہے ہوتے ملکہ صاحبزادے کے سر کے ٹوٹنے کی سزا میں ہماری ٹانگیں اس طرح توڑی جا رہی ہوتیں کہ ایک پیر گھر میں ہوتا اور ایک ہسپتال میں۔ ایک طرف ڈاکٹر کے یہاں دوڑنے کا مشورہ دیا جاتا اور دوسری طرف دوا فروش کے یہاں جانے کا حکم۔

کبھی بیگم کو سمجھانا پڑتا اور کبھی مجروح بچے کو۔ وہ کہتیں کہ خدا ہی اس کو بچائے اور ہم کو کہنا پڑتا کہ خواہ مخواہ وہم نہ کرو۔ خدا کے فضل سے وہ بالکل اچھا ہے۔ وہ کہتیں کہ خون اب تک جاری ہے اور ہم ان کو سمجھاتے کہ اس خون کا بہہ جانا ہی اچھا ہے وہ پوچھتیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اور ہم کو ڈاکٹروں کی طرف سے فی البدیہہ خدا جانے کیا کیا تصنیف کرنا پڑتا۔ راتوں کو بچے کی تکلیف کی وجہ سے ہم کو جاگنا بھی پڑتا۔ بیگم کہتیں کہ میں تیمار داری کرتے کرتے تھک گئی ہوں تو ہم کو ان کی تیمارداری شروع کرنا پڑتی۔ بیگم علاج کے سلسلہ میں روپیہ کی کمی کا رونا روتیں۔ تو ہم کو روپیہ لانے کے لئے خدا جانے کس قدر مقدمہ سازش میں شریک ہونے کے متعلق عذر کرنا پڑتا۔ مختصر یہ کہ ایک آفت ہوتی ایک مصیبت ہوتی۔ ایک قیامت ہوتی۔ مگر اب یہ معلوم ہوا ہے کہ

پچھونزے پر سے لڑکا گر پڑا ہے اور سر ذرا سا چھل گیا ہے۔ لیجئے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہم خوش۔ ہمارا خدا خوش۔ ہم نے بھی بحیثیت باپ کے مشورہ دے دیا کہ ذرا سا ٹنچر لگا دینا ورنہ گرمی کا زمانہ ہے کہیں مواد نہ پڑ جائے۔

اسی قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں حادثات سے خدا ہم کو بچاتا ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خواہ بیگم کے پاس کوڑی بھی نہ ہو اور تمام گھر کا کارخانہ قرض پر چل رہا ہو۔ مگر وہ بیچاری یہ نہیں کہہ سکتیں کہ خرچ کی تکلیف ہے ہماری تمام ضرورتیں تو خیر شاہانہ دریا دلی کے ساتھ پوری ہوتی ہی ہیں مگر ہماری ذات کے علاوہ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا علم ہم کو اس بادشاہ کی طرح بالکل نہیں ہوتا جس کی حکومت کا تمام انتظام وزرا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ محض شاہی کرتا ہے۔

اگر جناب ہم کو یہ مبارک مرض نہ ہوتا تو آپ جانتے ہیں کہ یہی ہماری ہمدرد اور نیک بیوی جو بظاہر فرماں برداری کا ایک نمونہ اور شوہر کی اطاعت کی ایک قابلِ تقلید مثال بنی ہوئی نظر آتی ہیں کیا کرتیں۔ یہ ہمارا ناطقہ بند کر دیتیں اور ہماری زندگی اس حد تک وبال بنا دیتیں۔ کہ ہم ہر وقت خودکشی کی تدابیر پر غور کرتے۔ مگر دل سے دعا نکلتی ہے اس اختلاج کے لئے کہ اس نے ہماری تمام

مشکلیں آسان کر رکھی ہیں اور ہماری زندگی کو تلخیوں سے قطعاً غیر متعلق بنا کر ایک فردوسی زندگی بخش رکھی ہے۔ گویا ذ شیقہ مل رہا ہے کسی شاہی خاندان کے چشم و چراغ کو۔

اب فرمایئے کہ آپ کے لئے اختلاج کا مرض پیدا ہونے کی دعا کی جائے؟ امتحاناً آپ فرضی طور پر اختلاج کے مریض بن کر دیکھیے کہ آپ کی کتنی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ گھر بھر کا نقشہ ہی نہ بدل جائے تو اس خاکسار کو نہ کہئے گا۔

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتر آتا ہے گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کر کے رہیگا۔ معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہرصورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے کہ اٹھائیس سال تک لکھنو میں مہمان رہے۔ وطن پردیس اور پردیس وطن بنا۔ ہر بنیا گلی گیا گلت بن گئی۔ نام کے ساتھ تھانوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے۔ اسی مسافرخانہ میں پڑھے لکھے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں بچوں کے باپ تک ہو گئے اور عین اسوقت جبکہ لکھنو قریب قریب وطن بن چکا تھا ازلی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی

پیرّوں کے سنیچر نے دشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آ کر نیا دانہ نیا پانی نئے آدمی نئے جانور یہاں تک کہ ادب بھی نیا ملا مگر طے یہ تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پرانے بال بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کیجئے یا آرزوئے دولت تمام ترمقصد یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی، ظاہر ہے کہ ایک پرولیری اس قسم کے مافوق کارانہ کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی غرض سے رجوع ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگ محترم کے دروازہ پر دستک دی گئی ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے ہم دونوں ہم دونوں ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "اخاہ" کا نعرہ بلند کر کے لپٹ گئے۔ پھر کرسیاں نکلیں پھر سکنجبین کی بارش شروع ہوئی پھر سگریٹ کی ژالہ باری ہوئی مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہو گیا، پردیس میں ایسے ہمدم دیرینہ کا ملنا واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان اس سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کر سکتے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے ہی پر ایسے خفا ہوئے کہ بمشکل راضی ہو سکے۔ کہنے لگے۔ "اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ۔"

عرض کیا "بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں وبالِ جان بن کر حاضر ہوا ہوں"۔ یہ کہہ کر تمام حالات سُنا دیئے کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے اور جب ٹیپ

کا بندہ عرض کیا کہ فوراً مکان دلوایئے ڈھونڈھ کر۔ تو ایک دم رُخِ روشن کی تمام روشنی غائب۔ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے گویا ہمارے لئے عالمِ بالا میں مکان تلاش ہو رہا ہے۔ سیٹی بجاتے رہے گویا اپنے کتے سے مکان کا پتہ پوچھیں گے۔ پھر سر پر ہاتھ پھیرا، کچھ منہ ٹیڑھا سا کیا۔ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر بڑے متفکرانہ انداز سے بولے "مکان؟"

عرض کیا "جی ہاں مکان، یہی جو مکان ہوتا ہے نا رہنے سہنے کے لئے یعنی کرایہ کا مکان، یہی پچاس ساٹھ کے کرایہ کا ہو۔"

اسی عالمِ جذب میں فرمایا۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مکان تو آج کل بڑا پرابلم ہے۔ بہرحال۔"

بے تابی سے عرض کیا "بہرحال؟"

ارشاد ہوا "مطلب یہ کہ غور کروں گا۔"

حیرت سے گذارش کی "غور کس بات پر کروگے یعنی یہ کہ مجھے مکان دلوانا چاہتے یا نہیں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے مکان فوراً چاہیے۔"

سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد فرمایا "بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔ بہرحال اور لوگوں سے بھی کہہ رکھو اور میں بھی کوشش کرتا ہوں۔"

ان حضرت کے وعدے میں ہم کو وعدہ کم اور اخلاق زیادہ نظر آرہا تھا لہٰذا ہم نے واقعی دوسرے لوگوں سے بھی کہنے کی ایمانداری کے ساتھ نیت کر لی مگر مصیبت یہ تھی کہ پہلے لوگ ڈھونڈے جائیں پھر اُن سے کہو کہ مکان ڈھونڈھو مگر وہ جو مثل مشہور ہے جویندہ یابندہ" ایک تو ملے ہوٹل کے گائیڈ یہ گرل گائیڈ قسم کے نہایت مستعد اور ہر دلعزیز آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آئے تھے کہ ان کا بس چلتا تو قلی کے بجائے خود ہی اسباب اُٹھا لیتے۔ جب سے بیچارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور خدمات لائقہ کا برابر تقاضہ فرمایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا کہ "بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوایئے کوئی۔"

پہلے تو وہ منہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے منہ سے گھور رہے ہیں پھر بڑے تعجب سے بولے۔ "مکان یعنی مکان آخر کیوں"؟

ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا "بھئی رہنا ہے نا۔ تو اس لئے مکان چاہئے ہے ہم کو۔"

کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا۔ "آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے"

ہم نے سمجھ کر بڑے زور سے کہا۔ "اوہو آپ غلط سمجھے۔ ہوٹل کی بات نہیں

ہے مجھے اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لئے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں۔"

گائڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا۔"ہوں۔ہوں تو گویا مکان۔مگر صاحب مکان ہے ---"

ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا ---- بڑا پرابلم ---"

گائڈ صاحب کہہ رہے تھے۔"مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیے میں برابر مکان کی فکر رکھوں گا۔"

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات ٹالی تھی۔ ان کو ہمارے مکان سے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہئے۔ ان سے ہمارا مطالبہ ہی غلط تھا مگر اہلِ غرض اندھے تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہونے کی سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ خیر یہی غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس ہو گیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق کہا جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے۔ چشمہ لگا کر آنکھ کی کمزوری کا اعلان کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نظرِ انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہوا یہ کہ گھر سے جوابی تار آیا تھا۔ اسی ہوٹل کے پتہ پر فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس

بات کا انعام دیا جاتا ہے کہ وہ کسی کے مرنے کا تار نہیں لایا۔ چنانچہ ہم نے بھی بزرگوں کی اس وضع کو قائم رکھا۔ تار والا نہایت شریف آدمی، نہایت اخلاق سے "اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ہم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ یہ تو خیر یوں ہی ہے البتہ اگر مکان دلواؤ کہیں سے ہم کو تو البتہ انعام دینگے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق یہ غور کر رہا ہے کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنا ٹھیک کہا جا سکتا ہے یا پنجرہ میں رہنا اور تفصیلی طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا "مکان۔ اچھا جی" تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں مگر ہم ٹھہرے اہل معاملہ فوراً سمجھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بیچارہ سلام کر کے رخصت ہوا اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہوگی نہ میں اپنی نجی باتیں بتلانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ایک لسی والے سے مکان کے لئے کہا اور محض یہ کہنے کے لئے لسی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لئے بال بنوا ڈالے۔ ایک تانگہ والے کے چہرے پر "ٹو لیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا لہذا ایک گھنٹہ کا کرایہ اُس کو دے دیا۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن یہاں

تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے لگی اور شام ہونے لگی مگر مکان نہ آج ملتا ہے نہ کل ملی ملائی اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگنے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے مقابلہ میں ملازمت سے دست برداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔

جستجو پر ایک وقت وہ بھی گذرتا ہے جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے اور منزل خود اسے ڈھونڈنے نکلے چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہنچ ہی گئے۔ گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے مگر تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لئے کہ مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا نشیمن خانہ بنائیں گے۔ ایک ہوٹل سے بات چیت بھی کر لی اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے کا ڈھنا صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا۔ ہم نے بے اختیار ان کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کیجئے کہ کل صبح چا میرے ساتھ نوش فرمایئے اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان دیکھنے۔" وہ فرشتہ رحمت نہ تھے ہی ہماری محبت کو بھلا کیسے ٹھکراتے وعدہ کر کے چلے گئے۔ لاہور آنے کے بعد آج پہلی

مرتبہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس پردیس نے اتنے دنوں کے بعد ہمارا انسان ہونا تسلیم کیا ہے۔ سر سے ایک بار اتر چکا تھا۔ پہلے مکان کے متعلق سوچا کرتے تھے اب اس کی آرائش کے پُر لطف خواب دیکھنے لگے۔ ایک کمرہ بنائیں گے اسٹڈی کا۔ اس میں لکھنے کی میز پر کوئی فضول سامان نہ ہوگا۔ البتہ ایک بڑا سا شیشہ ضرور ہوگا۔ سونے کا کمرہ ذرا ارمان انگیز ہونا چاہئے کہ آدمی جاگتے تو بھی خواب سا دیکھتا رہے یا خواب دیکھے تو قبر وغیرہ کے نہیں بلکہ ذرا اچھے قسم کے۔ اسی طرح ہر کمرہ کا ایک تصور آنکھوں کے سامنے تھا دل تو خوش تھا ہی طے کیا کہ چلو آج پکچر میں چلیں شاید ڈرائنگ روم کا کوئی نیا سیٹنگ نظر آجائے۔ کپڑے پہن پہن کر گنگنانے لگے :۔

اِک بنگلہ بنے نیارا

ہوٹل سے برآمد ہوتے ہی، وہی تانگے والا لپک کر سامنے آگیا۔ "واہ بابو جی ایک مکان آپ کے لیے ڈھونڈھا ہے تو اب آپ نہیں ملتے کل کسی وقت دیکھ لیجیے۔"

ہم نے سوچا کر دیکھیں مکان یا نہ دیکھیں۔ گائڈ صاحب کو اگر خبر ہوگئی کہ دیا اغیار کے ساتھ مکان دیکھنے گیا تھا تو برا مان جائیں گے مگر اس بیچارے نے بھی محبت ہی سے ہمارا خیال رکھا ہے لہذا کیا مضائقہ ہے اگر ہم چپکے سے مکان دیکھ آئیں۔ کچھ عوز

کرنے کے بعد کہا "کل نہیں اس وقت چلو تو چل سکتے ہیں کل ہم کو اور مکانات دیکھنا ہیں"
دل غنی ہو تو مکان کو آدمی مکانات کہنے لگتا ہے۔ یہ تو اعدادِ واحد و جمع کی غلطی نہیں
جذبات کی گرامر شناسی ہے۔ تانگہ والا تیار ہو گیا اور ہم اس کے تانگہ پر روانہ ہوئے
چلا چل۔ چلا چل۔ شہر کے تمام محلے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ یہاں تک کہ
لاہور کی تمام آبادیاں ختم ہو گئیں۔ مگر ہمارے مجوزہ دولت خانہ کا کہیں پتہ نہیں
تانگہ ہے کہ چل رہا ہے اور ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے
پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے اس ارادے پر شرما کر رہ گئے
کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبت میں اتنی دور تک خاک چھان کر ہمارے لئے
مکان ڈھونڈ نکالا ہے اور ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی
کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ غالباً اس غریب کو "پرابلم" کہنا نہ آتا تھا لہٰذا وہ بخطِ مستقیم چلا جا
رہا تھا۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا تو اس نے کسی اور شہر میں سہی بہرحال مکان
ڈھونڈھ دیا۔ آخر خدا خدا کر کے اب اس نے سڑکوں کو چھوڑ کر گلیاں دریافت کیں
ایک گلی سے دوسری میں۔ دوسری سے تیسری میں اور تیسری سے چوتھی میں جا کر
ایک جگہ تانگہ روک کر کہا "یہ ہے سامنے والا مکان"۔

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا "کونسا مکان؟"

اطمینان سے کہنے لگا۔ "وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے۔"

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آبنائے پر اس طرح پڑا ہوا تھا گویا جہاز ڈوب چکا ہے صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور یہاں پیرا کی سے قطعاً ناواقف۔ مرتے کھپتے دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جو جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مالکۂ مکان ایک بڑی بی اپنی بکری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں تاکہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا اور مکان دیکھنے کی غرض معلوم کرنے کے بعد بولیں "یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو میرا کیا ہے میں ایک کونے میں پڑی رہونگی۔"

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو تفریحاً دیکھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے مکان، گائڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائڈ صاحب نے چاہا کہ جب المکلف الخدمت کو ہیں منت فرما لیا تو مکان دکھانے لے چلے۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانہ میں مکان تھا غالباً نانا فرنویس کے زمانہ

میں اس کی پہلی مرتبہ مرمت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس مکان میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو بلاوجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے۔ گائڈ صاحب نے نام کے ساتھ "تھانوی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجئے چاہے پھلدار چمن بنا لیجئے مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ وہ بھی عجیب آثارِ قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے۔ طرّہ یہ کہ ہم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

"کیا رائے ہے"؟

ہم نے کہا "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کرونگا۔ پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق"

صاف گو تھے تو دیکھتے کہنے لگے "آپ اچھے رہیں گے اس میں"۔

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے اور اس کے بعد سے گانڈھا صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے کہ اگر مکان فوراً مل نہ جاتا تو عدم تشدّد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کر دی اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں، دروازے بھی، چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھڑیاں بھی ہیں اور باورچی خانے بھی مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جا سکتا البتہ کہنے تو "پرابلم" کہہ دیا کریں۔

اب سنیے دیگر پرابلموں کی ریل پیل :-

"مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوایئے۔"

"جی کیا کہا۔ ملازم؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے۔"

"مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں۔ مثلاً گھی۔"

"گھی ——؟ گھی تو بڑا پرابلم ہے۔"

"اچھا صاحب ڈالڈا سہی۔ ہم بناسپتی آدمی بن کر رہ لیں گے۔ مگر شکر۔"

"شکریہ جینی چاہتے ہے آپ کو ـــــ صاحب جینی تو بڑا پرابلم ہے۔"

"میں نے کہا۔ السلام علیکم ۔جینی کے لئے میں نے کارڈ حاصل کر لئے ہیں البتہ کوئلہ یا لکڑی کہیں سے دلوائیے۔"

"خدا جانتا ہے اسی فکر میں ابھی نکلا ہوں یہ ایندھن کا معاملہ بڑا پرابلم ہے۔"

مختصر یہ کہ لاحول ولا قوۃ جو چیز ہے پرابلم۔ جو بات ہے پرابلم تعلیم اسی پرابلم کے نہ یاد ہونے کی وجہ سے چھوڑی اب لاہور بھی یہ پرابلم چھوڑ وائے گا مصیبت تو اس پرابلم کمبخت میں یہ ہے کہ حل ہو جائے تو پرابلم نہ حل ہو تو پرابلم۔ پہلے تو صبر کر لیا تھا کہ شاید صرف مکان کو پنجابی میں پرابلم کہتے ہیں مگر اب تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب ہی کو پرابلم کہنا پڑیگا جہاں ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوئے جاتے ہیں ۔